ڈارلنگ
نریش کمار شاد

ڈارلنگ

(مطبوعہ بیری آرٹ پریس دریا گنج دہلی)

بار اوّل جنوری سنہ ۱۹۶۰

قیمت اڑھائی روپے

ڈارلنگ

نریش کمار شاد

پنجابی پستک بھنڈار دریبہ کلاں دہلی

اسی مصنف کی دوسری تصانیف

نظم

نبرت کدہ (ابتدائی غزلوں کا مجموعہ)
فریاد (تقسیم وطن سے متعلق منظومات)
دھنک (مجموعہ کلام)
آہٹیں (مجموعہ کلام)
[illegible] (قطعات کا مجموعہ)
آیات جنوں (مجموعہ کلام)
پھوار ([illegible] کی غزلوں کا انتخاب)
نغمے (منتخب نظموں کا مجموعہ)

نثر

شرح حاشیے (ادبی لطیفوں کا مجموعہ)
شام نگر میں سینما آیا (بچوں کے لئے کہانی)
بیبی بلبل (بچوں کے لئے کہانی)
سمندر کی شہزادی (بچوں کے لئے کہانی)

ترجمہ

الکار (غیر ملکی انقلابی نظمیں)
مالوا (میکسم گورکی کا ناول)
ڈاکو حملے (غیر ملکی کہانیاں)

زیر طبع

[illegible] (ناول)
منتخب غیر ملکی کہانیاں
زندگی سے بھاگ کر (ڈرامے)
مطالعے (مضامین)
بکھ بار (بچوں کیلئے نظمیں)

ترتیب

یونس دہلوی کے نام

جو میرے بیشتر افسانوں کی تخلیق کا محرک ہے۔

ڈارلنگ

" اجی چھوڑیئے یہ مَردوں کا عشق وشق. سب بکواس ہے". ایک سرے سے خودغرضی" عجیب بات تھی کہ آج مسز نونہال کی ہر بات کی تان ہندوستانی عورت کی بے بسی پر ٹوٹتی تھی۔ وہ اُردو کی عشقیہ شاعری پر اظہارِ خیال کرتے کرتے ایک دم جھلا کر کہنے لگی "جب تک عورت نہیں ملتی۔ دن رات اُٹھتے بیٹھتے یہ مرد ان کے نام کا وظیفہ کرتے ہیں اور جہاں وہ بیچاری گود میں آئی انھوں نے اسے کتے کی طرح دھتکار دیا۔ ہونہہ۔"

میں باتیں کرنے سے زیادہ آج باتیں سننے کی موڈ میں تھا۔ ویسے بھی مسز نونہال کی شخصیت اور اس کی گفتگو کی نفاست اور برجستگی میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ خواہ مخواہ بولنے کی بجائے سننے ہی کو جی چاہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلی ملاقات ہی میں مجھے اس کے کردار کے اس پہلو نے غیر معمولی

طور پر متاثر کیا تھا۔

"شاہ صاحب! معاف کیجئے۔ آپ کو دُکھ تو ہو گا۔ لیکن کیا کیا جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔" مسز نونہال کی باتوں میں مقناطیسی کشش کے ساتھ ساتھ تجربے کی گھمبیرتا بھی شامل ہو رہی تھی۔ اور وہ کہہ رہی تھی: "ہندوستانی مرد بیوی کو اپنا غلام سمجھتا ہے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی عورت کے مقابلہ میں اپنی برتری کے احساس کو نہیں بھولتا۔ آخر یہ کیا ظلم ہے۔ میں نے بڑے بڑے ذہین مرد بھی دیکھے ہیں۔ بڑے بڑے انٹلکچول جو تہذیب اور تمدن کے دعویدار بنتے ہیں اور جن کی زبان مساوات کہتے نہیں تھکتی۔ لیکن عورت کے معاملہ میں انہیں بھی بہت تنگ نظر دیکھا ہے ان کی زندگی میں بھی بیوی ایک ملازمہ سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔" اور یہ کہتے کہتے مسز نونہال خود بخود چپ ہو گئی اس کی آنکھیں جیسے کھو سی گئیں۔ میں بھی چُپ چاپ منتظر رہا کہ اب وہ کیا کہتی ہے۔

"آپ چائے پیجئے گا؟" مجھے خاموش دیکھ کر مجبوراً اسے خود ہی بولنا پڑا۔

"کوئی خاص ضرورت تو نہیں ہے۔" میں نے بڑی سادگی سے رسمی سا جواب دیکر بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"خاص نہیں تو عام ہی سہی۔" وہ اپنے گورے گورے گھُلے ہوئے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کی گلابی لہر دوڑاتے ہوئے بول اٹھی اور یہ کہکر کوچ پر لیٹے۔ لیٹتے ہی بلند آواز سے ملازمہ کو چائے لانے کے لئے کہہ دیا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد اکہرے جسم کی ایک دراز قد عورت چائے کا سیٹ لیکر ڈرائنگ روم میں داخل ہوگئی چائے کو پیالیوں میں انڈیل کر جب واپس جانے

لگی تو مسز نونہال نے کوچ سے اُٹھتے ہوئے اُسے رُکنے کا اشارہ کیا۔

" شاد صاحب! آپ شاہنی کو دیکھ رہے ہیں نا ۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا عمر ہوگی؟"

" شاہنی ۔ کون شاہنی؟" میں نے ایک نظر میں ملازمہ اور مسز نونہال کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

" شاہنی ۔ یہی ہماری ملازمہ ۔ اس کا نام شاہنی ہے نا ۔" اور مسز نونہال کی یہ بات سنکر میں نے ایک اُچٹتی ہوئی نظر ملازمہ پر ڈالی ۔ چہرہ بالکل بے داغ تھا رنگ دُھلی ہوئی گندم کی طرح ۔ البتہ کالی کالی گہری آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ ان میں زندگی کے حادثات کی چوٹوں کے زخم منجمد ہو کر رہ گئے ہیں۔

" یہی کوئی پچیس تیس سال ۔" میں نے سوچکر بڑی احتیاط سے جواب دیا اور میرے اس جواب سے ملازمہ اور مسز نونہال بیک وقت کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

" آپ کو غلط فہمی ہوئی ۔ شاہنی کی عمر بیالیس سال کی ہے ۔ کیوں شاہنی! ٹھیک کہہ رہی ہوں نا ۔" اور شاہنی اثبات میں سر ہلا کر جب کمرے سے باہر چلی گئی تو مسز نونہال نے گرم گرم چائے کا ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے کے بعد کہنا شروع کیا۔

" آپ کو اس عورت کی عمر کے بارے میں غلط فہمی ہوگئی لیکن خیر یہ کوئی ایسی بات نہیں بلکہ اگر آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہوتی تو مجھے تعجب ہوتا ۔"

" جی ہاں ۔ کم از کم چہرے سے تو وہ اتنی عمر کی دکھائی نہیں دیتی ۔" میں نے مسز نونہال کی بات کی تائید کرتے ہوئے جواب دیا۔

" ہاں یہی تو بات ہے ۔ اور آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بیالیس سال کی عمر

میں جس ہندوستانی عورت کے جسم کی یہ حالت ہے وہ جوانی میں کیا ہوگی ـــ۔ مسز نونہال نے "ہندوستانی" اور "عورت" کے لفظ پر خاص زور دیتے ہوئے کہا۔

"قیامت۔ بالکل قیامت۔" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اور آپ حیران ہوں گے شاد صاحب! ـــ" مسز نونہال پھر سنجیدہ ہوگئی تھی "جب شاہنی کی شادی ہوئی تو اس کے خاوند نے اُسے ایک نظر دیکھا تک نہیں۔"

"کیا مطلب ـــ!" میں نے واقعی حیران ہوکر سوال کیا۔

"وہ سور کا بچہ کسی دوسری لڑکی سے پھنسا ہوا تھا۔"

مسز نونہال کی سنجیدگی میں تلخی پیدا ہو رہی تھی۔ "اور اس نے شاہنی کو بات تک کرنے کے قابل نہیں سمجھا۔"

"تو پھر ـــ" شاہنی کی زندگی میرے لئے اب کسی کہانی کی طرح دلچسپ ہو رہی تھی۔

"پھر کیا ـــ یہ بیچاری دس سال سے ہمارے ہاں کام کر رہی ہے ہماری خاندانی ملازمہ ہے۔ میں اُس زمانہ میں مڈل میں پڑھتی تھی جب سے یہ ہمارے ہاں نوکری کر رہی ہے۔ اپنی شادی کے بعد میں اسے یہاں لے آئی۔ بے چاری کی جوانی ایسے ہی اکارت ہوگئی۔"

میرے دل میں شاہنی کیلئے ہمدردانہ جذبات بیدار ہونے لگے "بہت بُرا کیا اس کے خاوند نے ـــ" میں نے اپنی ہمدردی کا بڑے عامیانہ انداز میں مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہر خاوند اپنی بیوی سے برائی ہی کرتا ہے جی ـــ!"

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مسز نونہال نے چائے کی بجائے ابھی ابھی زہر کے گھونٹ پیے ہوں "عورت پر ہمیشہ ظلم ہی ڈھایا گیا ہے ـــ" اور مسز نونہال مردوں کے خلاف پھر اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد جب شاہنی چائے کے خالی سیٹ اٹھانے کے لئے پھر کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے بڑے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا بلاشبہ کسی زاویے سے اس کی عمر پچیس تیس سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس کے منہ پر واقعی بڑی رونق تھی اور اعضا بھی کافی سڈول اور متناسب تھے۔ البتہ اس کی کالی کالی آنکھوں کی حسرت ناک ویرانی اور خاموشی کو دیکھ کر میں بھی کچھ اداس ہو گیا۔

"شاہنی! کیا رام سنگھ کچن میں ہے۔" مسز نونہال شاہنی سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگی۔

"جی ہاں۔"

"اسے بھیج دینا۔"

شاہنی چلی گئی اور مسز نونہال میری طرف منہ پھیر کر کہنے لگی!

"لیجئے اب ایک بات اور سنیئے۔"

"جی۔" میں نے اداس اداس آنکھوں سے مسز نونہال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور بات کیا ہے" اور اتنے میں ٹھپ ٹھپ کرتا ہوا ... زین کے کوٹ اور پتلون میں ملبوس ایک سکھ نوجوان کمرے میں داخل ہو گیا۔

"رام سنگھ سائیکل پر جاکر نیواڑی سے کچھ پان لے آؤ دیکھو بنارسی پتے لانا" اور رام سنگھ کچھ کہے بغیر واپس چلا گیا اور مسز نونہال مجھ سے پوچھنے لگی۔

"آپ نے اس سرداد کو دیکھا۔"

"جی ــ"

"یہ ہمارے کچن میں باورچی کا کام کرتا ہے۔"

"جی ــ"

"اس لال بجھکڑ نے بھی شادی کر رکھی ہے اور ایک دفعہ جب یہ اپنی بیوی یہاں لے کر آیا تو پتہ ہے کیا ہوا؟

یہ جب صبح کچن میں آتا تھا تو اپنے کوارٹر میں بیوی کو بند کر کے باہر سے تالا لگا آتا تھا اور رات کو واپس جا کر دروازہ کھولتا تھا جیسے بیوی نہ ہو "اوڈی کلون" ہو، شیشی کھلی رہنے سے کہیں اڑ جائے گی۔ ہونہہ۔" وہ بڑے طنز سے اور دکھ سے بول رہی تھی۔

"بیوقوف ــ" بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔

"بیوقوف کہاں صاحب ــ کائیاں ــ بڑے کائیاں مرد کتنے ہی سادہ دکھیں، نہ ہوں اپنی عورت کے معاملہ میں بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ آپ دور کیوں جاتے ہیں میرا حال ہی دیکھ لیجئے۔" اور اس کے بعد وہ اپنے آپ بولتے بولتے رک گئی لیکن اس دفعہ میں اس خاموشی کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہ کر سکا۔

"آپ کا حال؟ ــ آپ کے حال میں کیا خرابی ہے؟ آپ تو بڑے مزے کی زندگی گزار رہی ہیں۔" اور یہ کہتے کہتے مسز نونہال سے پہلی ملاقات کا منظر ایک تصویر کی طرح میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ وہ ریڈیو اسٹیشن کی کسی تقریب میں ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے مجھ سے متعارف ہوئی تھی۔ اس شام اس کا میوزک

کا پروگرام تھا۔ پروگرام کے بعد وہ اور مسٹر نونہال مجھے ایک ریسٹورنٹ میں لے گئے تھے اور ہم وہاں دیر تک ہندوستانی آرٹ پر گفتگو کرتے رہے تھے۔ اپنی بات چیت میں مسز نونہال بار بار جس خلوص اور محبت میں ڈوبے ہوئے لہجہ سے نونہال کو "ڈارلنگ" "ڈارلنگ" کہکر پکارتی تھی اُس سے مجھے نونہال کی ازدواجی زندگی قابلِ رشک حد تک رنگین اور پُر مسرت معلوم ہوئی تھی اور اس ملاقات کے بعد کی ملاقاتوں میں بھی جب ان لوگوں سے میرے تعلقات کافی گہرے ہو چکے تھے۔ میں نے یہی محسوس کیا تھا کہ وہ دونوں بڑے کامیاب اور سکھی جیون ساتھی ہیں۔ لیکن آج مسز نونہال کی اس بات نے میری سوچ کی ندی میں بھنور ڈال دیئے اور وہ میرے چہرے کی حیرانی کو بھانپتے ہوئے کہنے لگی۔

"جی ہاں ۔۔ اس میں کیا شک ہے ۔۔ ؟" مسز نونہال کے طنز اور دکھ کی ٹھنڈی ٹھنڈی راکھ میں چنگاریاں سی سلگنے لگیں۔ "لیکن اب میں زیادہ دن شاید یہ غلامی کی زندگی بسر نہ کر سکوں ۔۔ آخر کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ انسان کے صبر کی"

"غلامی کی زندگی ۔۔۔ آپ اسے غلامی کی زندگی کہتی ہیں ۔۔ " میری سوچ کے بھنور اپنے آپ الفاظ میں ڈھلنے لگے۔

"ہندوستان کی ہر عورت شادی کے بعد غلامانہ زندگی ہی بسر کرتی ہے۔ شاد صاحب!" وہ پھر "ہندوستان" کے لفظ پر زور دے کر بڑے خطیبانہ انداز میں بولی۔

"میرا خیال ہے آج کوئی خاص واقعہ ہوا ہے۔"

"خاص واقعہ ۔۔ خاص واقعہ سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

اسی دوران میں رام سنگھ پان لیکر آگیا تھا اور مجھے جواب دینے کے لیے سوچنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ میں نے پان کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے رکتے رکتے کہا!
"میرا مطلب ہے کہ آج کوئی بات ہوگئی ہے ـــ شاید نونہال صاحب نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس نے وقتی طور پر آپ کو مردوں کے خلاف کردیا ہے۔"
"وقتی طور پر ـــ" وہ زہر بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگی ـــ
"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں جی۔ ایسے ناخوشگوار واقعات تو روزانہ ہوتے ہیں بلکہ ایک دن ہی میں کئی کئی بار ہوتے ہیں ـــ" اور پھر اس نے ایک ایک کرکے ایسے چھوٹے چھوٹے متعدد واقعات سناتے شروع کردیئے جن سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا تھا کہ اس کی شخصیت کو نونہال نے پامال کردیا ہے۔ نونہال کی بیوی بنکر اس کے کردار کی تمام تازگی اور شگفتگی فنا ہوگئی ہے اور اسی بےرنگ ماحول میں اس کے دل کی آزادی کا شجر کبھی ہرا نہیں ہوسکتا۔
"اور ایک دن تو شاہ صاحب! ـــ نونہال نے یہاں تک کہہ دیا۔" ابھی ایک اور بات یاد آگئی۔
"تم جو ہر وقت مجھ سے الجھتی رہتی ہو تمہیں پتہ ہے زندگی کے اس قدر آرام و آسائش تمہیں صرف میری وجہ سے میسر ہیں سارا سارا دن تم گانے بجانے میں صرف کردیتی ہو۔ دوسری عورتیں تو دن بھر جانوروں کی طرح گھر کے کام کاج میں جتی رہتی ہیں اور کچھ پتہ ہے میں نے اسکا کیا جواب دیا تھا ـــ" ایک دم بھپرتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔ "میں نے کہا کہ میں بھاڑ میں جھونکتی ہوں تمہارے ان آرام و آسائش کو انھوں نے تو میری شخصیت کو اپاہج بنا دیا ہے۔ میری

خوشیوں کے پنکھ کاٹ لئے ہیں۔ میرے جذبوں کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اور اس کے جواب میں نونہال بڑی اکڑ فوں سے کہنے لگا اگر یہ بات ہے تو کل سے کچن کا سب کام تم خود کیا کرو۔ میں سب نوکروں کو ابھی سے جواب دے دیتا ہوں اور جب میں نے یہ کہا کہ چلو ٹھیک ہے، میں اس دن ہی کچن کا کام سنبھال لوں گی جس دن تم بھی صبح سے شام تک اپنے فارموں میں خود ہل جوتو گے ـــــ اور میری یہ بات سنکر جناب کی ساری شیخی کرکری ہو گئی۔"

میں بڑے انہماک اور توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور میری طرف ایک اچٹتی ہوئی نگاہ دوڑا کر وہ اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے پھر کہنے لگی۔

"بس جی اسی بات کا گھمنڈ ہے نا ان مردوں کو کہ وہ کما کر لاتے ہیں اور عورتیں مفت میں کھا جاتی ہیں۔ مگر میں کیا پرواہ کرتی ہوں۔ میں خود ابھی کام کر سکتی ہوں پڑھی لکھی ہوں۔ جہاں جی چاہے ملازمت کر سکتی ہوں۔ ریڈیو والے میرے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ وہ ہر ہفتہ مجھے پروگرام دینے کے لئے تیار ہیں ـــــ"

"لیکن شادی سے پہلے آپ نے ان سب باتوں پر غور نہیں کیا تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سوال کر دیا۔

"سول میرج تھی جناب ـــــ ورنہ اب تک تو یہ حضرت مجھے کب کے چھوڑ چھاڑ چکے ہوتے ـــــ" مجھے مسز نونہال کی یہ بات قابلِ اعتبار نہیں معلوم ہو رہی تھی مگر کرب اور افسردگی میں دبی ہوئی اس کی آنکھیں اس کی صداقت کی گواہی دے رہی تھیں۔ اس لئے میں چپ ہو رہا اور اس سلسلے میں کوئی اور سوال پوچھنے میں مصلحت نہ سمجھی۔ لیکن اس کے بعد مسز نونہال کی زبان کبھی جھک گئی اور ہم

دیر تک اپنی اپنی جگہوں پر بے حس مجسموں کی طرح خاموش بیٹھے رہے۔
اچانک شاہنی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس گہری خاموشی کو توڑا۔

"بی بی جی بابو جی آ رہے ہیں۔"

مسز نونہال بدستور بت بنی رہی۔ البتہ میں نے شاہنی سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"نونہال صاحب آ گئے ہیں کیا؟"

"جی ہاں ابھی ابھی آئے ہیں۔" اور شاہنی کے اتنا کہتے کہتے ہی نونہال کمرے میں داخل ہو گئے۔

ان کے قدم بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور سر کے لمبے لمبے گھنے بال آنکھوں پر بکھر رہے تھے۔ میں آج پہلی دفعہ انہیں اس حالت میں دیکھ رہا تھا۔

"اوہ کوی جی! ـــ کوی جی!" وہ مجھے اسی نام سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ "کب آئے۔ میرا مطلب ہے کب تشریف لائے ـــ اچھے تو ہیں آپ ـــ کوئی خدمت ـــ میرے لائق کوئی خدمت۔"

وہ دست بستہ سوال پر سوال کرتے جا رہے تھے میں خاموش بیٹھا رہا اور ایکدم مسز نونہال کے بے حس مجسمہ میں غصے اور نفرت کی ایک برقی لہر دوڑ گئی۔

"آج پھر آپ اپنے آپ میں نہیں ہیں۔ پینے سے پہلے کچھ تو سوچ لیا کیجئے۔"
نونہال یہ سنکر ایک احمقانہ سی ہنسی ہنستے ہوئے بولے۔

"پنیا - اور سوچنا - تمہیں سوچو تم کیا کہہ رہی ہو۔"

اور پھر نونہال گردن لٹکا کر کوچ پر بیٹھ گئے اور کچھ لمحوں تک کمرے پر پھر خاموشی چھا گئی۔

"میں آج ایک بات کا فیصلہ کرنا چاہتی ہوں ۔۔۔"

مسز نونہال نے بڑے فیصلہ کن انداز میں کمرے کی خاموشی کو چکنا چور کرتے ہوئے کہا!

"کس بات کا ڈارلنگ ۔۔۔ کس بات کا فیصلہ۔" جھکی ہوئی گردن کے ساتھ نونہال بڑبڑانے لگے۔

"آخر اس گھر میں میری کیا حیثیت ہے۔ آخر میں بھی تو جینے کا کوئی حق ہے میں اس زندگی سے اکتا چکی ہوں۔" مسز نونہال تیز تیز لہجہ میں بولتے ہوئے ایک دم رک گئی۔

"تم چاہتی کیا ہو - کچھ پتہ بھی تو چلے ۔۔۔" نونہال نے سر اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

"میں غلام ہو کر نہیں جینا چاہتی ۔۔۔"

"غلام ۔۔۔ کس کی غلام ۔۔۔ کون غلام بناتا ہے تمہیں تم کیسی باتیں کر رہی ہو"

"ہاں ہاں غلام ہی تو ہوں ۔۔۔" مسز نونہال پھر ایکدم غضبناک ہو گئی "آپ جب چاہیں اور جہاں چاہیں چلے جائیں اور میں اس کوٹھی کی گھٹی گھٹی فضا میں پانو بجاتی رہوں بس یہی آزادی ہے جو آپ نے مجھے دے رکھی ہے۔"

"مگر میں تمہیں کہیں جانے سے کب روکتا ہوں ۔" نونہال نے جھلاتے ہوئے کہا۔

"آپ کو میری پرواہی کیا ہے۔ آپ تو کامنی کی دلداری کیجئے۔"

"کامنی ۔" نونہال کی نشہ آلود آنکھوں میں جیسے جگنو سے چمکنے لگے "کتنی اچھی لڑکی ہے۔ بھولی بھالی اور ..."

"اور حرام زادی ۔"

"دیکھو ایک شریف لڑکی کو گالی دینے کا تمہیں کوئی حق نہیں ۔ بالکل کوئی حق نہیں۔"

"میں سب جانتی ہوں ۔" مسز نونہال نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا

"کیا جانتی ہو؟ ۔"

"کامنی اگر شریف ہوتی تو رات، رات بھر آپ جیسے شریفوں کے ساتھ کلبوں اور پارکوں کی خاک نہ چھانتی ۔"

"کیا بک رہی ہو؟ ۔"

"بک رہی ہوں ۔ اب سچی بات کہی تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔"

اور مسز نونہال کی یہ بات سُن کر نونہال کی آنکھوں کے جگنو دہکتے ہوئے شعلوں میں منتقل ہونے لگے۔

"اگر آپ کے یہی چلن رہے تو ۔"

"تو کیا ۔؟" نونہال نے غراتے ہوئے کہا۔

"میں چلی جاؤں گی۔ چلی جاؤں گی یہاں سے ۔" یہ کہتے کہتے مسز نونہال

کی آواز بھرا گئی اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"چلی جاؤ۔ بڑے شوق سے چلی جاؤ ــــ مجھے پروا نہیں ــــ میں کیا پروا کرتا ہوں۔" نونہال کوچ پر لیٹتے ہوئے نیم بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑانے لگے۔

اور میں نے دیکھا مسز نونہال سچ مچ سسکیاں بھرتے ہوئے باہر چلی گئی۔

"میرا خیال ہے میں انہیں واپس بلا لاؤں۔" اٹھتے ہوئے میں نے نونہال سے مخاطب ہو کر کہا۔

"نہیں جی کوئی جی! بیٹھئے آپ۔ بیٹھئے آپ۔ یہ کہیں نہیں جائے گی اور جا بھی کہاں سکتی ہے۔"

"لیکن وہ تو ــــ"

اور نونہال میری بات کاٹتے ہوئے بول پڑے۔

"اجی کوئی جی کہیں نہیں جائے گی۔ میں جو کہتا ہوں وہ کہیں نہیں جا سکتی۔ وہ نڈ کہتی ہے میں چلی جاؤں گی۔ چلی جاؤ۔ لیکن کبھی نہیں جائے گی۔ چپکلی کی طرح میرے ساتھ چمٹی ہوئی ہے ــ بالکل چھپکلی کی طرح۔"

ایک لمحہ کے لئے رک کر نونہال پھر بڑے نفرت انگیز لہجہ میں دھیرے دھیرے بولنے لگے۔

"ایک دفعہ یہ لڑجھگڑ کر سچ مچ یہاں سے چلی بھی گئی تھی کوئی جی ــــ! میں نے بھی سوچا تھا چلو سستے چھوٹے خلاصی ہوئی مگر پورے ایک سال بعد اپنے پاپا کو لیکر یہاں آ گئی ــــ اور اس کا پاپا ــــ وہ کھوسٹ میرے پاؤں پڑ پڑ کر مجھے اپنی عزت اور آبرو کے واسطے دینے لگا۔ بڑا ناز تھا نا اسے اپنے پاپا پر ــــ قہقہہ، قہقہہ، قہقہہ ــــ

اور یہ کہتے کہتے وہ ایک مجرمانہ سی ہنسی ہنسنے لگے جیسے انہیں اپنی بات کا خود یقین نہ آ رہا ہو۔

"لیکن آپ کی مسز تو کافی پڑھی لکھی ہیں، نونہال جی، وہ تو ۔۔۔"

نونہال مجھے ٹوکتے ہوئے برس پڑے "خاک پڑھی لکھی ہے بات تک کرنے کی تمیز نہیں۔ میری تو زندگی اجیرن کر رکھی ہے اس عورت نے ۔۔۔" اور پھر اپنی مسنری کے خطیبانہ انداز میں کہنے لگے "کوی جی! عورت کتنی ہی پڑھی لکھی کیوں نہ ہو پھر بھی عورت کی عورت ہی رہتی ہے"

میں نے کسی قسم کی بحث کا آغاز کرنے کی جائے اسے میں خاموش رہنے میں بہتری سمجھی، لیکن نونہال نے اس کے بعد کوچ پر لیٹے لیٹے اپنے آپ ہی اپنا تاثر درج کر دیا کہ کامنی بڑی مہذب اور شائستہ لڑکی ہے اسے پینٹنگ کا بہت شوق ہے۔ وہ بڑی حسین تصویریں بناتی ہے اور خود بھی تو ایک حسین تصویر دکھائی دیتی ہے حسین اور معصوم۔ اور وہ اس کو پیار کرتے ہیں وہ بھی ان پر جان دیتی ہے۔ آج وہ رسی کے ہاں سے آ رہے ہیں وہاں انھوں نے کامنی سے شمپین کے چھ بڑے پیگ پیئے تھے ۔۔۔ اور پھر ان کے اصرار پر کامنی نے بھی تھوڑی سی پی لی تھی اور پینے کے بعد یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے پتلے پتلے گلابی ہونٹوں میں پارہ بھر گیا ہو۔

شراب نے نونہال نے کی شخصیت کے مٹے مٹے، اور دھندلے دھندلے خدو خال کو نکھار دیا تھا ان کی ٹوٹی پھوٹی متضاد باتیں اور اکھڑا ہوا لہجہ دونوں میرے لئے دلچسپی کا باعث تھے۔ میں اس وقت تک بڑی توجہ سے ان کی ایک ایک بات کو سنتا رہا جب تک بولتے بولتے ان کی سرشار اور بوجھل آنکھیں بند نہیں ہو گئیں۔

ان کے سو جانے کے بعد میں دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آیا باہر دروازے پر شانتی دونوں ہاتھوں میں کھانے کی پلیٹیں لیے کھڑی تھی اور رام سنگھ سرگوشی میں اُسے اندر جانے سے منع کر رہا تھا۔

میں نے اُن دونوں پر ایک اچٹتی ہوئی غیر دلچسپ نظر ڈالی اور اس کے بعد میری نظر مسز نونہال پر پڑی جو روتے روتے شاید ہری ہری گھاس ہی پر سو گئی تھی۔ میں نے ایسے میں اُسے بلا کر جگانا مناسب خیال کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کوٹھی سے باہر چلا گیا۔

اس واقعہ کے تھوڑے دن بعد ہی مجھے جالندھر سے دلی آ جانا پڑا۔ اور تقریباً تین مہینے بعد ایک شام کناٹ پلیس کے کسی ریسٹورنٹ میں اچانک ان لوگوں سے ملاقات ہو گئی۔ مسز نونہال۔ نونہال اور ان کے کچھ دوست ایک ٹیبل کے گرد بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں اور بات بات پر نونہال اپنی مسز کو اس طرح ڈارلنگ۔ ڈارلنگ کہہ رہے تھے۔ جیسے اس ایک لفظ میں ان کی زبان نہیں ان کا محبت بھرا دل بول رہا ہو اور مجھے دیکھتے ہی ڈارلنگ کے چہرے پر جیسے تلخ سی مسکراہٹ رینگنے لگی۔

" شاہ صاحب۔ آئیے آئیے شاہ صاحب آپ یہاں کب سے۔ آپ تو پھر کبھی آئے ہی نہیں ـــــ آخر ایسی بھی کیا بات ہے۔ " مسز نونہال اس وقت مجھے کسی پر کٹے گھائل پرندے کی طرح کراہتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور پھر قریب بٹھا کر جب نونہال نے مسکراتے ہوئے میری طرف منہ پھیر کر پوچھا۔

" کوی جی! آپ کیا پئیں گے۔ کافی یا کولڈ۔ " تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔ " کوی جی بیٹھیے آپ یہ کہیں نہیں جائے گی۔ میں جو کہتا ہوں کہ یہ کہیں نہیں جائے گی۔ اور پھر جا بھی کہاں سکتی ہے ـــ "

پنجرے کا پنچھی

دوسرے روز شام کے ٹھیک پانچ بجے نیاز اور کلدیپ نے وعدے کے مطابق وہاں پہنچ کے ونٹنگ دی تو اندر سے حشمت باہر آیا اور تھوڑی چند سیڑھیاں طے کر وا کر انہیں مکان کی دوسری منزل کے ایک چھوٹے سے منقش اور خوب صورت کمرے میں لے آیا جس کی ساری جگہ تین مخملی صوفوں اور دو مختصر سی چوبی کرسیوں نے گھیر رکھی تھی اور ان صوفوں اور کرسیوں کے عین وسط میں ایک خوبصورت تکونی میز لگائی ہوئی تھی۔

نیاز اور کلدیپ کرسیوں پر بیٹھ گئے اور حشمت ایک صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔

"نیاز صاحب اب تو آپ کی صحت پہلے سے کافی اچھی ہے ۔"

"اچھی اور بری کا کیا سوال ۔ یہاں صحت ہی کہاں ہے بھائی !" نیاز کی اس بات پر کلدیپ اور حشمت کھل کر ہنس پڑے اور نیاز نے ہنسی چین الن سا ساتھ دینے کی

بجائے اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

" میں تھوڑا سا پانی پیوں گا "

اور حشمت نے صوفے پر لیٹے لیٹے کھڑکی کی طرف مونہہ پھیر کر نیچے آواز دی۔

" ارے کھائی لطیف پانی کا جگ لانا " اور نچلی منزل سے "ابھی لایا" کی ایک موٹی سی آواز گونج کر فضا کے سکوت میں مدغم ہوگئی۔

اور پانی کا گلاس پی لینے کے بعد نیاز نے زحمت انتظار کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا

" کیوں جی! بیگم کہاں ہیں، ابھی تک اوپر نہیں آئیں۔ "

" بس آنے ہی والی ہوں گی ۔ "

حشمت نے جیب سے گولڈ فلیک کی ڈبیا نکالتے ہوئے جواب دیا۔

" کہیں گئی ہیں کیا؟ "

حشمت ڈبیا میں سے ایک ایک سگریٹ نیاز اور کلدیپ کو پیش کرتے ہوئے بولا۔

" ہاں چار بجے کے قریب کینٹ ملنے تک گئی تھیں۔ "

" کیوں — ! " کلدیپ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے خواہ مخواہ سوال کر دیا۔

اور پھر جیسے دوسرے لمحہ بعد ہی اسے یہ احساس ہوگیا کہ یہ انتہائی ذاتی قسم کا سوال پوچھنے کا اسے کیا حق ہے لیکن حشمت نے اسی ۔۔۔ ازانہ لب ولہجہ میں جواب دیا۔

" شاپنگ کرنے گئی ہیں شاید "

اور پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے حشمت نے کہا۔

" نیاز صاحب، آپ نے بمبئی تو دیکھی ہوگی ۔ "

" ہاں صاحب " نیاز نے بڑے روکھے پھیکے لہجہ میں جواب دیا " تین چار سال

تک ہم متواتر بمبئی ہی میں رہے۔"

حشمت نیاز کی بات ان سنی کرتے ہوئے بولا

"کیا شہر ہے صاحب! اپنی تو عمر ہی وہاں گذری۔ بڑے بڑے کارنامے کئے ہم نے وہاں سرکار۔" اس کے بعد اپنے ایک ایک کارنامے کی پوری تفصیل سناتے ہوئے حشمت نے بتایا کہ وہاں اس نے بڑے بڑے غنڈوں کو نیچا دکھایا۔ کئی دادوں کے دماغ درست کر دئے اور بمبئی بھر میں اس کی جواں مردی کی دھوم مچ گئی۔

"اور نیاز صاحب! وہاں کسی کی کیا مجال تھی کہ بیگم کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکتا ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ......"

اور اس سے پہلے کہ حشمت اپنی جواں مردی کی ایک اور داستان بیان کرے نیاز نے بڑی غیر دلچسپ نگاہوں سے اسے ٹوکتے ہوئے پوچھا۔

"تو بیگم اس زمانے میں بھی آپ کے ساتھ تھیں کیا؟"

"ہاں صاحب ان کا اور ہمارا ساتھ بہت پرانا ہے۔ دس سال ہو گئے ہم ان کے ساتھ ہیں ویسے ہماری اور بیگم کی بڑی قریب کی رشتہ داری بھی ہے۔ یوں سمجھئے کہ میری اہلیہ مرحومہ اور بیگم سگی بہنیں تھیں۔ دونوں کی عادتیں بالکل ایک جیسی تھیں نیاز صاحب! جب بیگم کی بہن خدا انہیں جنت میں جگہ دے میرے ساتھ بیاہی گئیں اس وقت بیگم کی عمر غالباً پندرہ برس کی ہوگی۔۔۔"

اور پیشتر ازیں کہ حشمت کو اپنی شیطان کی آنت کی طرح طول طویل اور لامتناہی بات کو پورا کرنے کا موقع ملے سیڑھیوں میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور حشمت خود ہی اپنی بات ادھوری چھوڑ کر بولا۔

" لیجیے آ گئیں بیگم ۔"

بیگم سے کلثوم ایک دل کش خیال کی طرح کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی

" اہا کلدیپ صاحب، دار نیاز صاحب بھی ۔۔ خدا کی قسم دل باغ باغ ہو گیا آپ کو دیکھ کر ۔"

کلثوم کا دل تو خدا جانے باغ باغ ہوا یا نہیں لیکن اس کی مترنم اور کھنکتی ہوئی آواز سے کلدیپ اور نیاز کی تھکی تھکی آنکھوں اور ان کے شاعرانہ ذہنوں میں جہاں ڈیڑھ گھنٹے کے متواتر انتظار اور حشمت کی قصہ خوانی نے بیزاری اور اکتاہٹ پیدا کر دی تھی کلیاں سی نہ در چٹک گئیں۔

" مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگوں کو بہت دیر تک میرا انتظار کرنا پڑا۔ میں نے کل آپ کو پانچ بجے تشریف لانے کے لئے کہا تھا نا ۔"

اور پھر اپنے سوال کے جواب کا انتظار کئے بغیر، حشمت کے ساتھ والے دنے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

" ہوا یوں کہ آج کینا ٹ پلیس میں مجھے پھر کپتین راجا ں گئے ۔۔ وہی نا جو کل میرے ساتھ تھے تقریباً پون گھنٹے تک ہم پلیس میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے کیسے بڑے ہی زندہ دل قسم کے انسان ہیں کپتین راجا بھی ۔" اور پھر میز پر دھرے ہوئے جگ میں سے پانی کا ایک گلاس پیتے ہوئے کلثوم بڑی مخصوصیت سے اپنے تراشیدہ سیاہ اور خوشبو میں لپٹے ہوئے بالوں سے آنچل ہٹاتے ہوئے کہنے لگی۔

" کلدیپ صاحب دیکھیے آج میں نے بال بھی بنوائے ہیں ۔ وہ باربر بھی بڑے مزے کا آدمی تھا کہنے لگا بیگم آپ نے بال ترقی رتی طور پہ ہی ترشے ہوئے ہیں انہیں اور

تو منڈوانے کا تکلف آپ کا ہے کو کرتی ہیں۔"

اور پھر اپنی نظریں حشمت کے بھینچے ہوئے جبڑے پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"منو حشمت آج منگل کا دن تھا۔ اس نا صاحب مجھے بال منڈوانے کے بعد عین چھ بجے ہوا۔"

اور منگل کا نام سنتے ہی نیاز کو بس جیسے دھچکا سا لگا۔ اس کی پیشانی کی لکیریں پھیل کر گڈمڈ ہوگئیں اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے حشمت نے گھبراتے ہوئے کہا۔

" تو پھر کیا ہوگا ؟"

" ہونا کیا ہے " ـــــ کلثوم نے ہنستے ہوئے اپنے چرمی بیگ سے سولن کی بوتل نکالتے ہوئے اپنے مخصوص جولین اور شرابیہ لہجے میں کہا۔

" زندہ رہیں ہمارے کیپٹن راجا بھی بہت ہی شریف آدمی ہیں کیپٹن صاحب ہیں نے جب انہیں کہا کہ جیسے بھی ہو وسکی کی ایک بوتل کا انتظام کر دیجئے۔ ہمارے کچھ خاص دوست باہر سے آئے ہوئے ہیں تو بے چارے نے اسی وقت ملٹری کی کینٹین میں آدمی بھیج کر یہ بوتل منگوا دی۔"

اور پھر کلثوم نے اپنی موٹی موٹی خواب ناک آنکھیں نیاز کی طرف گھما دیں جو چپ چاپ کرسی میں اس طرح دھنسا ہوا تھا جیسے کوئی پرندہ اپنے گھونسلے میں بیٹھا ہوا ہو۔

" نیاز صاحب ! آپ بھی دل میں مجھے کوس رہے ہوں گے۔ خدا کی قسم میں واقعی بہت نادم ہوں۔"

اور کمرے کی ساری فضا جیسے پیچ و خم نیاز کے ساتھ گنگنانے لگ پڑی۔ کمرے کا سویا سویا ماحول یکایک چونک سا پڑا۔ دیواروں کے رنگین اور خاموش

نقوش ہیں دیکھتے ہی دیکھتے جیسے سرد تازگی اور نئی زندگی کی گرم گرم نمکیلی لہریں دوڑنے لگیں۔ اور آناً فاناً میز پر سوڈے کی بوتلیں، برف کے ٹکڑے اور بلوری گلاس سج گئے۔
حشمت نے سوہن کی بوتل کا کاک اڑاتے ہوئے ایک ایک پیگ چار گلاسوں میں ڈال دیا اور کلثوم ایک ہی دفعہ پورا پیگ پی کر صوفے پر لیٹ کر گولڈ فلیک کی ڈبیا سے سگریٹ نکالنے لگی۔

"تمہیں کتنی دفعہ سمجھایا ہے کہ ایک دم مت پیا کرو۔ جگر خراب ہو جائے گا۔"
حشمت نے ناصح مشفق کا رول ادا کرتے ہوئے کہا
"تم میرے جگر کی فکر مت کرو۔ سگریٹ سلگاؤ۔ ماچس ہے تمہارے پاس؟"
اور پھر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتے ہوئے وہ اپنی رسیلی اور مترنم آواز میں کسی عشقیہ غزل کے شعر گانے لگی۔
اور نیاز بڑے سہمی سہمی آواز میں پوچھنے لگا
"آپ کے پڑوس میں کون لوگ رہتے ہیں"
"ایک پنجابی ہیں۔ ریلوے میں فورمین ہیں شاید۔" حشمت نے جواب دیا۔
"یہ لوگ آپ کی نقل و حرکت پر اعتراض تو نہیں کرتے۔" نیاز نے رکے رکے لہجہ میں اپنے اندیشہ کا اظہار کرتے ہوئے پھر سوال کیا۔
اور حشمت قہقہہ لگاتے ہوئے بولا "آپ بھی کمال کرتے ہیں نیاز صاحب! میرے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے کہ منہ کھول سکے۔ خدا کی قسم کوئی ایک حرف بھی منہ سے نکالے تو زبان گدی سے کھینچ لوں۔"
اور کلثوم اور نیاز حشمت کی جرأت مردانہ کی داد دینے کی بجائے

اختیار ہنسنے لگے اور کلثوم جیسے اس طنزیہ ہنسی کی گہرائی تک پہنچتی ہوئی بولی۔

اور پھر یہ چارے پنجابی تو ہیں ہی اچھے آدمی بڑے ہی نیک سب ہماری عزت کرتے ہیں۔ کبھی کوئی جھگڑے والی بات ہی پیدا نہیں ہوئی۔"

چاروں گلاسوں کو خالی دیکھ کر حشمت نے ایک ایک پیگ ڈال دیا اور کلثوم اپنے گلاس کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے اپنی گفتگو کی کڑی کو دوبارہ اپنے پڑوسیوں سے جوڑتے ہوئے کہنے لگی۔

" نیاز صاحب! ہماری پڑوسن سچ مچ بڑی سیدھی سادی عورت ہے سیدھی سادی شریف گرہستن۔ جس کی اپنی ایک چھوٹی سی دنیا ہے اور ایک خاوند ہے۔ جب وہ پنجابن موہنہ اندھیرے اٹھ کر منی کے باپ کے لئے کھانا پکانے میں مصروف ہوتی ہے" کلثوم کے موہنہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر باہر آنے لگے اور بڑی مگن آواز میں اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا ــــــ " تو نہ جانے اسے دیکھ کر مجھے الجھن سی کیوں ہونے لگتی ہے۔"

" الجھن ــــــ ؟ " کالدیپ نے حیرت بھری نگاہیں کلثوم پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

" جی ہاں۔ " کلثوم پھر اسی اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولنے لگی۔

" مجھے خیال آتا ہے جیسے میں کہیں کھو گئی ہوں ــــــ جیسے میرا رستہ کھو اور تھا ـــ جیسے اگر میں بھی ـــ " اور اس سے آگے وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی۔ اور اس کی نشیلی آنکھیں جیسے کہیں کھو سی گئیں۔

اور حشمت کو ایک دفعہ پھر جیسے ناصحِ مشفق بننے کا موقعہ ہاتھ آ گیا۔

"چھوڑو کلثوم تم کیا سوچنے لگیں۔ کوئی کام کی بات کرو۔"

لیکن کلثوم کوئی کام کی بات کرنے کی بجائے بدستور کھوئے کھوئے انداز میں بولتی گئی۔

"نیاز صاحب! مجھے کسی سے ——"

اور نیاز کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں، ایک دم کوئی چیز چمک اٹھی اور وہ ہمدردی اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے کہنے لگا۔

"ہاں ہاں تمہیں کسی سے کیا ہو گیا ہے کلثوم ——"

"عشق ——" کلثوم نے خود ہی اپنی بات مکمل کر دی اور اس کے گورے گورے بدن میں جیسے ایک گلابی سی لہر دوڑ گئی لمبی لمبی گھنی پلکیں ایکا ایکی جھک سی گئیں۔ "میرا خیال ہے مجھے شادی کر لینی چاہیئے" کلثوم نے یہ جملہ کچھ اس طرح ادا کیا جیسے وہ خود حیران ہو کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

"شادی" حشمت کلثوم کی حیرت کا مونہہ چڑاتے ہوئے بڑی خوفناک ہنسی ہنستے ہوئے صرف ایک ہی لفظ بول کر چپ ہو گیا۔

اور کلدیپ دوسرا پیگ ختم کرتے ہوئے اپنی مخصوص، لاابالیانہ مسکراہٹ کے ساتھ کلثوم کے لب و لہجہ ہی میں دہرانے لگا۔

"عشق —— عشق" اور پھر ناگہانی طور پر اس لاابالیانہ مسکراہٹ کا پھوڑا زہر خند کی صورت میں کھوٹ نکلا "بکواس ہے۔ عشق وشق کچھ نہیں۔ عشق محض دماغی عارضہ ہے اور کوئی صحت مند انسان اس زمانے میں کسی سے عشق نہیں کرتا۔" طنز اور دکھ سے بھرے ہوئے لہجہ میں کلدیپ چیخ چیخ کر کہنے

لگا: "میں کہتا ہوں کہ تم صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تمہیں ایک مرد کی ضرورت ہے۔ ایک مضبوط۔ نوجوان اور سڈول جسم کے مرد کی جس سے تم زیادہ سے زیادہ جسمانی لذت حاصل کر سکو۔" کلدیپ جیسے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگا اور کلثوم سنجیدگی کے سمندر میں ڈوبتی چلی گئی۔

"ویل ڈن، ویل ڈن۔ کلدیپ دی گریٹ۔ شراب کے دو پیگ پی کر ہی تم اچھے خاصے مقرر بن جاتے ہو مائی ڈیر کلدیپ" نیاز نے بڑی خوبصورتی اور چابک دستی سے اپنے ذہنی ترکش سے طنز کا ایک تیر چھوڑتے ہوئے کلدیپ کو مصلحتاً خاموش کرا دیا۔

اور کلثوم سنجیدگی کے گہرے سمندر سے اپنے مسکراتے ہوئے ہونٹوں اور موٹی موٹی خواب ناک آنکھوں کے ساتھ ایک دفعہ پھر ابھرتے ہوئے بولی

"تمہارا خیال ہے کلدیپ ہی خود اس بات کو نہیں سمجھتی لیکن ایک عورت کو پُرسکون زندگی بسر کرنے کے لئے سے سڈول جسم ہی کی نہیں کچھ اور چیزوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔"

"خدا کے لئے اپنا یہ فلسفہ ختم کرو کلثوم۔" حشمت نے اپنے ناصحانہ انداز میں کسی قدر اپنے خشم آلود تحکم کو شامل کرتے ہوئے کہا "لو یہ سب کا آخری پیگ ہے ــــ" اور یہ کہہ کر اس نے بوتل اٹھائی اور باقی شراب چار گلاسوں میں تقسیم کر دی اور سب سے پہلے حشمت نے خود ہی اپنا پورا پیگ ایک دم حلق میں انڈیل کر غیر معمولی طور پہ سنجیدگی اور خاموشی اختیار کر لی۔

اور کلثوم کے ہونٹ اس دفعہ گلاس کو چھوتے ہی جیسے گلاب کی

پتیوں کی طرح پھڑپھڑانے لگے۔ انگ انگ پارے کی طرح تھرکنے لگا اور تراشیدہ بال کسی پہاڑی ندی کی بلورے بہتی ہوئی لہروں کی طرح اس کے شانوں پر لہرانے اور مچلنے لگے۔ اور حشمت کی طرح غٹاغٹ پورا پیگ پی لینے کے بعد اس نے کلدیپ کی طرف دیکھکر کہا

" کلدیپ سنو ـــــ تمہیں یاد ہے تم پہلی مرتبہ کہاں ملے تھے ؟"

" بالکل یہیں اسی کمرے میں ـــــ میرا ایک شاعر دوست مجھے اپنے ساتھ لے کے یہاں آیا تھا ؟" اور کلدیپ کی آنکھیں اپنے گلاس سے ہٹ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

" مجھے تو اچھی طرح یاد نہیں کلدیپ ! کہ تم مجھے پہلی بار کہاں ملے تھے لیکن وہ مشاعرے والا قصہ شاید زندگی بھر نہ بھلا سکوں ـــــ "

" مشاعرہ " نیاز کی سوچ کے خاموش تاروں کو جیسے مشاعرہ کے لفظ نے جھنجھنا دیا اور کلدیپ پھٹی پھٹی سوالیہ آنکھوں سے کلثوم کو گھورنے لگا۔

مگر کلثوم اپنے بہکے بہکے انداز میں بولتی جا رہی تھی

" سالا وہ بوڑھا کھوسٹ شاعر کہنے لگا کہ کلثوم بیٹھے گی تو میں اس کار میں سوار نہیں ہو سکوں گا۔ جیسے کلثوم عورت نہ ہو چھوت چھات کی کوئی بیماری ہو ـــــ " اور یہ کہتے کہتے کلثوم کی روح جیسے دانت پیسنے لگی۔

" مگر تم نے یہ کہکر کلدیپ ! اس بوڑھے کے استخوانی جبڑے پر گویا زور کا طمانچہ دے مارا تھا کہ اگر کلثوم کار میں نہیں بیٹھے گی تو میں بھی اس میں سفر نہیں کر سکوں گا یہ کلثوم کی نہیں ہم سب شاعروں کی توہین ہے ـــــ اور مجھے سچ مچ اس دن پہلی مرتبہ تمہاری ویران اور مغموم آنکھوں میں آدمیت کی روشنی نظر آئی تھی۔ میرا جی

چاہتا تھا کہ بڑھ کر تمہارے بھولے بھالے زرد چہرے کو چوم لوں ۔ " کلثوم کا لہجہ خطرناک حد تک جذباتی اور کرب انگیز ہوتا جارہا تھا ــــــ " اور پھر تمہیں یاد ہے کلدیپ کار کے بجائے ہم ریل گاڑی سے دہلی آئے تھے ساری رات میرٹھ کے سٹیشن پر ہمیں گاڑی کا انتظار کرنا پڑا تھا ۔ لیکن اس انتظار میں تکلیف نہ تھی ۔ سکون اور اطمینان تھا "

نیاز بڑی دلچسپی اور توجہ سے کلثوم کی باتیں سن رہا تھا ۔ حشمت کی سنجیدگی اور خاموشی میں غنودگی بھی شامل ہو رہی تھی اور کلدیپ اپنے گلاس کی باقی ماندہ شراب کو گھور گھور کر اپنی ویران اور مغموم آنکھوں کی دنیا آباد کرنے کی کوشش کر رہا تھا

" نیاز تم اور کلدیپ واقعی اچھے آدمی ہو ــــــ " کلثوم نے اپنے موضوعِ گفتگو میں اب نیاز کو بھی شامل کر لیا تھا " میں لاکھ آوارہ لاکھ ذلیل اور لاکھ بُری سہی لیکن تم لوگوں کے ساتھ جو لمحے گذرتے ہیں وہ ہمیشہ مجھے یہی احساس دلاتے ہیں کہ میرے اندر ایک ایسی عورت اب تک سانس لے رہی ہے ۔ جس کی پاکیزگی اور جس کا خلوص آج بھی زندہ ہے ۔ "

کلثوم کی آواز بھر اسی گئی اور نیاز نے اپنے ترکش سے ایک اور تیر چھوڑا ۔

" خدا اس کی عمر دراز کرے ــــ "

اور اس طنز نے جیسے کلثوم کی آنکھوں پر مختلف حادثوں کی چوٹوں کو ابھار دیا

" تم لوگ اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ میرے دل میں تمہارا کتنا احترام ہے ۔ تم نہیں جانتے جب بھی تم لوگ مجھے کہیں نظر آجاتے ہو میں ایک بھکارن کی طرح تم سے خیرات مانگتی ہوں ــــــ میں سچ مچ بھکارن ہی تو ہوں جو اپنی جھولی پھیلائے ہوئے

ہر آنے جانے والے سے شفقت، اور خلوص کی بھیک طلب کرتی ہے ۔۔۔ ، اور یہ کہ کر کلثوم بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔

اور حشمت ایک دم کروٹ بدل کر غنودگی اور خاموشی کے پھاٹک سے گھبرا کر باہر نکلتے ہوئے چیخ اٹھا ۔

" میں اسی لئے تمہیں زیادہ پینے سے منع کرتا ہوں ۔ پینے کے بعد تم بالکل بے قابو ہو جاتی ہو ۔ بلاوجہ رونے لگ جاتی ہو ۔ اور آئیں ۔ بائیں شائیں جو مونھ میں آتا ہے بولنے لگتی ہو ۔۔۔ "

" بکواس بند کرو حرام زادے ۔ "

" حرام زادے ـــــ حرام ـــــ زادے ۔ " یہ لفظ کمرے کی مدہوش اور رنگین فضا میں متعفن بارود کے ایک گولے کی طرح پھٹا ۔ کلثوم تو ایک ہی سانس میں اتنا کہہ کر چپ ہو گئی لیکن اس کے باوجود اس خاموشی کے سینے میں اس گولے کی دھمک دیر تک گونجتی رہی اور پھر کلدیپ نے اس خاموشی کو بجار کا سلسلہ توڑتے ہوئے بڑے انکسار سے کہا ۔

" معاف کیجئے حشمت صاحب ! مجھے افسوس ہے کہ محض میری اور نیاز کی وجہ سے یہ سب بدمزگی پیدا ہوئی ۔ "

" نہیں صاحب اس میں آپ کا کیا قصور ہے ۔ " یہ کہتے ہوئے بھی حشمت کی آواز میں غصے کی زہریلی لہریں تیر رہی تھیں ۔

" ہاں کلدیپ تمہارا تو کوئی قصور نہیں ۔ " کلثوم نے بھی جیسے حشمت کی تائید کی اور اس کے دوسرے لمحہ بعد ہی اسے نہ جانے کیا یاد آ گیا " قصور تو سب میرا ہے

جو آج تک دنیا کے ہر انسان کو بالکل اپنا ہی سمجھتی رہی لیکن ہر انسان آگے چل کر اس کے حق میں کسی نہ کسی شکل میں حرامی ثابت ہوتا رہا۔"

اور حشمت نے نفرت کا جواب نفرت سے دیتے ہوئے لیٹے لیٹے ہی بڑبڑانا شروع کر دیا۔

"تم جو چاہو میرے بارے میں رائے قائم کر سکتی ہو۔ مگر جو جو کام میں نے تمہارے لیے کیے ہیں جان جوکھوں میں ڈال کر جو جو مصیبتیں مجھے تمہاری وجہ سے برداشت کرنا پڑی ہیں اور محض تمہاری ذات نے مجھے دنیا میں جس قدر ذلیل اور رسوا کیا ہے وہ میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ اگر تم انہیں سمجھ سکتیں تو ایسی باتیں کہہ کر اپنے احسان فراموش ہونے کا ثبوت نہ دیتیں ـــــ"

"احسان فراموش" کلثوم صوفے سے اٹھ کھڑی ہو گئی "ٹھیک ہے میں احسان فراموش ہوں ـــــ" یہ کہہ کر اس نے غصے کی شدت میں میز پر دھرے ہوئے چاروں گلاس ایک ایک کر کے توڑ ڈالے۔ حشمت، کلدیپ اور نیاز سحر زدہ ہو کر اسے دیکھتے رہے مگر کسی کو روکنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

"میں احسان فراموش ہوں اور تم کون ہو ـــ بے ایمان، ذلیل کتے۔"

کلثوم کسی ناگن کی طرح اپنی باتوں میں اپنا بس گھولتی ہوئی بولتی چلی گئی "اگر میں احسان فراموش ہوتی تو تم آج یہاں مزے سے سوہن کی شراب کے گھونٹ اپنے حلق میں اتارنے کے بجائے کوکین بیچنے کے جرم میں کسی جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں سڑ رہے ہوتے تمہارے جسم پر یہ ریشمی چمکیلا سوٹ نہ ہوتا۔ تمہارے پاؤں میں کریپ سول کے جوتے نہ ہوتے تمہاری کلائی پر یہ طلائی رسٹ واچ نہ ہوتی۔ تمہارے

بالی ایوننگ اِن پیرس کی پاس بیں ڈوبے ہوئے نہ ہوتے ۔ اپنے وہ دن یاد کرو جب کانپور میں تمہیں دن دن بھر روٹی کے ٹکڑے کے لیے ترسنا پڑتا تھا ۔ پورے شہر میں تمہیں کوئی چند پیسے تک قرض دینے کے لیے تیار نہیں تھا ۔۔۔

حشمت کی جواں مردی کا طلسم بُری طرح ٹوٹ رہا تھا ۔ کلدیپ اور نیاز کی نگاہیں سوالیہ نشان بنی ہوئی حشمت کے چہرے پر منڈلا رہی تھیں اور کلثوم ابھی تک بول رہی تھی ۔

" کمینے ! میں نے اپنی جوانی اور دوشیزگی کا رس بیچ بیچ کر تمہاری زندگی کے حُسن کو سینچا ہے ۔ یہ گھر یہ صوفے ، یہ کرسیاں یہ ساری لذتیں سب میری وجہ سے ہیں ۔ اُلو کے پٹھے ! یہ سب میری جوانی کے خواب ہیں ۔ ایک سادہ لوح اور ناکام عورت کی جوانی کے خواب جنہیں کئی کالی اور بدکار راتوں نے تمہارے سوٹوں ، تمہارے جوتوں ، تمہاری رسٹ واچوں میں منتقل کر دیا ہے ۔۔۔ "

کلثوم بولتے بولتے ایک دم لڑکھڑا کر صوفے پر گر پڑی اور حشمت دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا ایک لفظ تک کہے بغیر چپکے سے نیچے اتر گیا ۔ چند لمحوں تک کمرے پر ایک بوجھل خاموشی اپنے پنکھ پھیلائے رہی اور پھر کلثوم صوفے پر لیٹے ہوئے بولی ۔

" کیا تم لوگ بھی مجھے بُرا سمجھتے ہو ۔ "

اور کلدیپ اور نیاز اس کے جواب میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے

" بولتے کیوں نہیں ۔ کیا تم بھی حشمت کی طرح دل ہی دل میں مجھے ذلیل تو نہیں سمجھتے ۔ " اور پھر کچھ سوچ کر وہ خود ہی کہنے لگی " لیکن تم ایسا سمجھنے میں حق بجانب ہو ۔ "

اور نیاز نے درد و حسرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا

کلثوم! تم ٹھیک کہتی تھیں تمہارے اندر کی عورت واقعی ابھی تک زندہ ہے"

"بلکہ ان دنوں عورت تم سے بھی بازی لے گئی ہے۔" کلدیپ نے نیاز کے تجزیہ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

اور کلثوم کچھ بولنے کی بجائے سسکیاں بھرنے لگی اور اس کی سسکیاں فضا میں کچھ اس طرح گھل مل گئیں کہ کمرے کی ہر چیز روتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ اور مرمریں دیواروں کے رنگ برنگے نقوش انسانی خون کے دھبوں کی طرح دکھائی دینے لگے۔

اور پھر ملازم اپنی خواب آلود آنکھیں ملتا ہوا کھانا لے کر جب کمرے میں آیا اس وقت تک کلثوم صوفے پر بیٹھے بیٹھے اور سسکیاں بھرتے بھرتے اور شب خوابی کا لباس تبدیل کئے بغیر سو چکی تھی۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔" نیاز نے ملازم کی طرف ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"کھانا لے جاؤ مجھے بھی بھوک نہیں۔" کلدیپ نے دیواروں کے خونی دھبوں پر اپنی نگاہوں کے پنجے گاڑتے ہوئے اس طرح کہا جیسے کہہ رہا ہو کہ ان دھبوں سے کلثوم کے خون کی بو آتی ہے۔ میں ان کے نقوش کو کیوں کر چبا سکتا ہوں؟

اور ملازم جب کھانا لے کر نیچے چلا گیا تو نیاز نے خالی صوفے پر لیٹتے ہوئے کہا "کلدیپ بجلی بجھا کر تم بھی ساتھ والے صوفے پر آ کر لیٹ جاؤ۔ کافی رات ہو چکی ہے"

اور کلدیپ نے جب اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی تو پورے دو بج چکے تھے۔

اور پھر کمرے کی ساری فضا۔ کلثوم۔ اور کلدیپ کے چہرے ایک سنسان تاریکی

میں ڈوب گئے۔

اور کلدیپ دیر تک صوفے پر لیٹا لیٹا گزشتہ تو گھنٹوں کے واقعات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں ناچتا ہوا بار بار کلثوم کا چہرہ ہیولوں کی طرح ابھرنے، پھیلنے اور مٹنے لگا۔ کئی طرح کے ٹیڑھے میڑھے سوال اس کے ذہن میں کلبلانے لگے۔ وہ جب کوئی واضح نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا خیالات اس کے دماغ سے پھسل پھسل جاتے ـــــ اور اسی ادھیڑ بن میں نڈھال ہو کر وہ بھی نیاز کی طرح نیند کے جھولے میں جا گرا۔

اور صبح جب نیاز نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے اُسے بیدار کیا تو وہ کچھ ایسی اجنبی نگاہوں سے لیٹے لیٹے کمرے کی چیزوں اور دیواروں کو گھورنے لگا۔ جیسے انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو اور گھورتے گھورتے اس کی نظر اس صوفے پر بھی پڑی جہاں رات کو کلثوم سوئی تھی اور صوفے کو خالی دیکھ کر وہ ایک دم گھبرا کر بولا۔

" کلثوم کہاں گئیں نیاز ـــــ "

" میں بھی ابھی ابھی جاگا ہوں اور میرے جاگنے سے پہلے ہی وہ جا چکی تھیں "

نیاز نے جواب دیا۔

اور پھر وہ دونوں رات کی باتوں پر تبصرہ کرنے لگے۔

کلدیپ کہنے لگا۔

" واقعی عظیم عورت ہے۔ ایسے ماحول میں بھی اپنے خلوص اور اپنی انسانیت کو زندہ رکھنا اسی کا کام ہے۔ "

اور رات تو اس نے حد کر دی۔ جب وہ حشمت سے باتیں کر رہی تھی تو مجھے

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی دکھی اور زخمی ضمیر کراہ رہا ہے۔ کتنا درد اور کتنی صداقت تھی اس کے لہجہ کی کڑواہٹ میں" نیاز جیسے بولتے بولتے کھو سا گیا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں دور خلار میں لٹک سی گئیں۔

اچانک گھٹی گھٹی سسکیوں کی مدھم آواز نے ان دونوں کو پھر سے چونکا دیا۔

"ان سسکیوں کی آواز تو بڑی مانوس معلوم ہوتی ہے۔۔

"کیا کلثوم ابھی تک رو رہی ہے۔"

"شاید" کلدیپ نے جواب دیا۔

اور پھر شاید کو یقین میں ڈھالنے کے لئے کلدیپ نے اُٹھ کر آہستہ سے کھڑکی کھول کر نیچے کی طرف جھانکا تو وہاں صحن میں ایک چارپائی پر حشمت لیٹا ہوا تھا اور کلثوم اس کے سرہانے بیٹھی نمناک آنکھوں سے اسے دیکھتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"حشمت مجھے معاف کردو۔ شراب پی کر واقعی میں اپنے آپ میں نہیں رہتی۔ تمہاری قسم مجھے کچھ یاد نہیں کہ رات میں نے نشے میں تمہیں کیا کچھ کہہ دیا"

اور کلدیپ نے مڑ کر نیاز کی طرف دیکھا تو وہ بھی بڑے غور سے کلثوم کی آواز پر کان لگائے بیٹھا تھا۔ اور پھر دونوں ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ ایک بیمار اور مرجھائی ہوئی سی مسکراہٹ ان کے چہروں پر پھیل گئی۔ اور کلدیپ آہستہ سے نیاز سے پوچھنے لگا۔

"کیوں کیا خیال ہے نیاز اب بھی تم اس عورت کو عظیم کہو گے"۔

"کیوں نہیں ——— تم دیکھ نہیں رہے وہ مرنا نہیں چاہتی اس فضا میں بھی اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ کیا اس کی یہ خواہش اور یہ سمجھوتہ

اس کی عظمت کی دلیل نہیں ۔"

نیاز کی بے جان اور پژمردہ مسکراہٹ کسی سنگین تجربے کی طرح تلخ ہو رہی تھی اور نچلی منزل سے کلثوم کی دبی دبی آواز ابھی تک سنائی دے رہی تھی ۔

" معاف کردو ـــــــــــــــــــــــ مجھے معاف کردو میرے اچھے حشمت ! "

کروٹ

توشی کے جاتے ہی پال کے دماغ میں جیسے نفرت کا غبار پھوٹ پڑا چہرے پر
ایک کڑوی اور بوجھل سنجیدگی رینگنے لگی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ پال کو توشی پر بہت غصہ
آرہا تھا۔ چھپکلی سی دبلی پتلی چھوکری کتنی بے شرم اور بے باک ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے تو کچھ
جھجک تھی۔۔۔ مگر اب تو وہ بھی نہیں۔ دن بھر دفتر کی فائلوں سے چھٹکارا پاکر میں گھر میں
داخل ہونے بھی نہیں پاتا کہ یہ کمر لچکاتی، کولھے مٹکاتی جھٹ آ دھمکتی ہے بلاوجہ سہارا
لینے کے بہانے اپنا سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیتی ہے۔ اور پھر بات بات پر مسکراتی ہے
ہنستی ہے بچوں کی طرح قہقہے لگاتی ہے۔ بے حیا اتنا بھی نہیں سوچتی کہ اب
میری شادی ہو چکی ہے —— رانی۔ —— اس کے سامنے بیٹھی ہوئی دل میں
کیا سوچتی ہوگی۔ لیکن رانی —— وہ بھی تو کچھ نہیں کہتی اسے کسی بات کا احساس
ہی نہیں ہوتا۔ بالکل بے حس ہوکر بیٹھی رہتی ہے۔ توشی کی ہر بات میں خواہ مخواہ دلچسپی

یتی ہے۔ اسے ہنستا دیکھ کر خود بھی ہنسنے لگتی ہے۔ خواہ وہ ہنسی بے مقصد ہی کیوں نہ ہو۔ نہ جانے رانی کیوں نہیں سوچتی کہ توشی کو میرے ساتھ اس طرح بے تکلف ہو کر بیٹھنے کا حق کیا ہے۔ وہ بات بات پر کیوں ہنستی ہے لیکن رانی کے نزدیک تو شاید یہ سب باتیں بے مطلب ہیں ان کا کوئی مقصد ہی نہیں۔

توشی کی بجائے پال کو اب رانی پر غصہ آنے لگا۔

"رانی" پال نے اپنے لہجے میں تمکنت اور تحکم پیدا کرتے ہوئے کہا۔

رانی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کی گھنی پلکیں اوپر اٹھائیں اور "جی" کہہ کر پھر جھکا لیں۔ اس کے چہرے کی نکھری ہوئی معصومیت گلاب کے پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ "دیکھو رانی" پال نے پھر اسی تمکنت اور تحکم سے کہا

رانی کی گوری اور لمبی لمبی انگلیاں بدستور سلائیوں میں الجھی رہیں۔ چند لمحوں تک وہ چپ چاپ اپنے کام میں مشغول رہی اور پھر ایک دم اس کے چہرے پر مسکراہٹ سی جھلملا اٹھی۔

اسے مسکراتا دیکھ کر پال جیسے بھول گیا کہ وہ کیا کہنے والا تھا ایک لمحہ کے لئے وہ گھبرا سا گیا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ رانی کیوں مسکرا رہی ہے شاید وہ اس کی کمزوری بھانپ گئی تھی۔

تھوڑی دیر پال اس طرف دیکھتا رہا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھا رانی کے ہاتھ سے سلائیاں لیکر ایک طرف رکھ دیں اور رانی مسکراتی ہوئی آڑی ترچھی نظروں سے پال کو دیکھ کر اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی، پال نے جھک کر اسکی چکنی اور ملائم پیشانی چوم لی۔ اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے اس کے سلگتے تپتے ہوئے ذہن میں کسی

نے پھوار ڈال دی ہو۔ پال کتنی ہی دیر تک سوچتا رہا کہ رانی کتنی بھولی بھالی اور معصوم ہے۔ زمانے کے نشیب و فراز کی اسے کوئی خبر نہیں۔ حالانکہ اس دنیا میں قدم قدم پر احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ بھولپن اور معصومیت زندگی اور زندگی کی مسرتوں کی دشمن ہے یہاں آ کر پال کے خیالات کی ڈور جیسے ٹوٹ گئی اور ایک دم چونک کر اس نے رانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا " رانی! جانتی ہو تو شی یہاں کیوں آتی ہے؟"

" اوں ــــ ہوں " رانی نے اس کی گود سے اٹھتے ہوئے انکار میں سر ہلا دیا۔ اب پال اسے کیا بتائے کہ تو شی یہاں کیوں آتی ہے آنے کو تو وہ پہلے بھی یہاں آتی تھی۔ شادی سے پہلے وہ کچھ دنوں کے لئے پال کی دلچسپیوں کا مرکز تھی۔ دونوں چوری چوری ملا کرتے تھے۔ گلی محلے والوں کی نظروں سے بچ بچ کر وہ پال کے پاس آیا کرتی تھی اور پال بھی مختلف بہانے تراش تراش کر اس کے گھر جاتا رہا تھا۔ لیکن یہ باتیں چند مہینے پہلے کی تھیں جب پال کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ کیوں آتی ہے گلی محلے والے اب اس کی نگرانی کیوں نہیں کرتے۔ اب وہ سب کے سامنے آتی ہے۔ پہلے کی طرح ذرا بھی نہیں جھجکتی کوئی اسے مشتبہ نظروں سے نہیں دیکھتا۔ کیوں۔ آخر کیوں؟

جیسے اب پال کے گھر میں کھلے بندوں آنا معمولی بات ہے شاید اس کے ماں باپ سمجھتے ہیں کہ وہ پال کے پاس نہیں رانی کے پاس جاتی ہے۔

پال نے پھر رانی کی طرف دیکھا اس کا چہرہ سوالیہ نشان بنا ہوا تھا وہ الجھن میں پڑ گیا۔ آخر وہ رانی کو کیا بتائے۔ اس نے رانی سے ایسا سوال ہی کیوں کیا۔

" رانی اصل میں بات یہ ہے کہ میں خود نہیں جانتا کہ وہ کیوں آتی ہے ہو سکتا

ہے وہ تمہارے پاس یوں ہی دِل بہلانے آتی ہو۔"

یہ کہکر پال پھر اس کے چہرے کے ٹھہرے ٹھہرے خطوط کو گھورنے لگا۔

"یہ کونسی بڑی بات ہے پردیسی ایک دوسرے کے پاس آکر نہ بیٹھیں تو کہاں جائیں۔"

پال نے جس ڈھب سے بات کہی تھی وہ اس کی تہ تک نہ پہنچ سکی تھی پال پھر سوچنے لگا کہ رانی شادی سے پہلے بھی ایک لڑکی تھی اور شادی ہو جانے کے بعد بھی وہ ایک لڑکی ہی رہی۔ اور وہ بے حیا توشی اس کی نسبت کتنی چالاک ہے۔ توشی کا خیال آتے ہی پال کو پھر غصہ آگیا۔ کم بخت اب میرے پاس کیوں آتی ہے اب خالی پڑ ہو چکی ہے۔ اب اس گھر میں کیا کام ہے اُس کا اور رانی بھی کتنی سادہ ہے۔ کچھ سمجھتی ہی نہیں وہ دوپٹہ شانوں پر ڈالے ننگے سر سینہ ابھارے چلی آتی ہے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنسی ٹھٹھول کرتی ہے۔ بات بات پر شانہ بھڑاتی ہے جیسے وہ میری بیوی ہو اور یہ رانی محض ایک مہمان کی حیثیت سے اس گھر میں رہ رہی ہو۔

"رانی! چند مہینوں کے بعد تم ایک بچے کی ماں بننے والی ہو۔۔" پال نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور رانی کی طرف دیکھنے لگا۔

شرم کی ہلکی ہلکی دھاریاں رانی کی کالی کالی آنکھوں میں اُچھلنے ناچنے لگیں اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ جیسے کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ پال پھر جھنجلا گیا یہ ابھی تک اپنے آپ کو لڑکی کیوں خیال کرتی ہے۔ عورت کیوں نہیں سمجھتی، میں تو توشی کو گھر آنے سے نہیں روک سکتا۔ چند مہینے پہلے اسے خوش آمدید کہتا رہا ہوں۔ اب کس منہ سے کہوں کہ وہ یہاں نہ آیا کرے مگر رانی چاہے تو ایسا کر سکتی ہے۔ لیکن رانی ؟

وہ ابھی تک ماں والی بات سے شرم محسوس کر رہی تھی۔

" پگلی " پال نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنا سر اور بھی جھکا لیا جیسے ماں بننا بہت شرم کی بات ہو۔ اور اپنے دل میں سوچ رہی ہو کہ اب تو وہ ایک لڑکی ہے۔ جب ماں بنے گی تو دیکھا جائے گا۔ کچھ دیر تک وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر سلائیاں اٹھائیں اور پہلے کی طرح کچھ بننے میں مصروف ہوگئی۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے پھر اس نے پال کی طرف دیکھا وہ صوفے کی پشت پر اپنا سارا بوجھ ڈالے ایک طویل انگڑائی لے رہا تھا ایک نظر اسے دیکھ کر وہ پھر سلائیوں پر جھک گئی ایک لمحہ بعد پھر اس نے دیکھا۔ پال کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔

" کیا بات ہے رانی؟ " پال نے پوچھا۔

" کل ہمیں سینما لے چلئے گا نا؟ "

" ضرور توشی بھی ساتھ چلے گی۔ " پال نے توشی کے لفظ پر خاص زور دیتے ہوئے کہا کہنے کو تو رانی نے ہاں کر دی۔ لیکن پال کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا جی نہیں چاہتا کہ توشی بھی ساتھ چلے۔

اگلے دن جب وہ دفتر سے نکل کر بائیسکل پر سوار ہو کر گھر پہونچا تو رانی اور توشی جانے کیلئے تیار بیٹھی تھیں۔ اس نے دونوں پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ دونوں نے بناؤ سنگار میں پوری محنت صرف کی تھی اس نے ایک ہی نظر میں دونوں کی طرف دیکھا اور انہیں دیکھتے ہی ایک شریر خیال نے اس کے دماغ میں سر ابھارا وہ توشی کے بالمقابل کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا...

" توشی آج تم نیلے سمندر کی جل پری معلوم ہوتی ہو۔ " اور یہ کہکر اس نے توشی کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ وہ ہولے سے مسکرادی۔ پھر پال نے اس کے آویزوں

چھوتے ہوئے کہا۔

"یہ جھلملاتے ہوئے آویزے کتنے خوبصورت ہیں۔"

"شکریہ" توشی نے اپنی آواز میں شہد گھولتے ہوئے کہا۔ پال نے چور نظروں سے جب رانی کی طرف دیکھا تو اس کے خوبصورت اور بے داغ چہرے پر غصے اور نفرت کی پرچھائیاں چھا رہی تھیں۔

" یہ ہلکی پھلکی چوڑیاں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔" پال نے اس کی کلائی کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تو توشی نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ اور رانی قریب سے اٹھ کر دور کونے میں جا بیٹھی۔

" رانی! کیا بات ہے۔ آؤ سینما چلیں۔ وقت ہو رہا ہے۔ پال نے اپنی آواز میں گھبراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

" میں نہیں جاؤں گی۔"

" کیوں؟"

" میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

" ابھی تو تم اچھی بھلی تھیں۔"

" میں نے کہہ جو دیا میں نہیں جاؤں گی۔ آپ دونوں چلے جائیں۔" رانی کا غصہ آنسوؤں کی شکل میں اس کی گھنی پلکوں پر نمودار ہو گیا تھا

" اچھا توشی! اگر رانی نہیں جاتی تو ہم بھی نہیں جاتے۔" یہ کہکر وہ صوفے پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجبوراً توشی کو اپنے گھر جانا پڑا۔ پال نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اور اطمینان کی ایک طویل سانس لیتے ہوئے پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

لیکن ابھی تک   رانی کی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور پال صوفے پر بیٹھے بیٹھے دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ کیونکہ رانی کے اندر سوئی عورت آج جاگ پڑی تھی۔ وہ پہلی بار اسے عورت کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔

کپور اور ٹھاکر کل صبح سیر و سیاحت کی غرض سے ایک سال کیلئے یورپ جا رہے تھے۔ اور میں نے آج کی رات کے لئے انہیں گرینڈز میں مدعو کر لیا تھا

ہم تینوں سرِ شام ہی گرینڈز میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے بیئر کا دور چلا اور بیئر پیتے ہوئے زیادہ تر باتیں یورپ کے ان مقامات کے بارے میں ہوتی رہیں جن سے ہم میں سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔

اس کے بعد وسکی کی باری آئی۔ تیسرے پیگ تک تو خیریت رہی۔ ٹھاکر تو یوں بھی "قدرِ دریا نوش" تھا اور اتنی پی کر بھی اس کی سنجیدگی اور توازن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ البتہ کپور چوتھا پیگ پیتے ہوئے قدرے بہک چکا تھا۔

آج ڈائننگ گرل نے پھر میٹھی میٹھی طنزیہ نظروں سے کپور کی طرف دیکھا۔ اور وہ آپے سے باہر ہوتا ہوا چلانے لگا ——— "کیا دیکھتی ہے میری جان!

——— میں جانتا ہوں تیری ان میٹھی اور طنز بھری نظروں کی قیمت صرف تیس روپے فی رات ہے۔"

"تیس روپے فی رات ——" اور پھر کپور نے متعدد بار سنایا ہوا اپنا قصہ دہرانا شروع کر دیا۔

تیس روپے فی رات سے بات چلتی چلتی عورت کی مظلومی تک جا پہنچی۔

"ہندوستانی عورت —— یعنی مشرقی عورت ———— بے حد مظلوم ہے —— صدیوں سے اس کے جذبوں کا نیلام ہو رہا ہے ——— اس کے پیار کو سونے اور چاندی کے سکوں میں تولا جا رہا ہے ——— اس کے آنسوؤں سے مسرت اور مستی کی شراب کشید کی جاتی رہی ہے ——— اس کا انگ انگ گھائل ہو چکا ہے ——— اس کی روح میں پوری کائنات کا درد سمٹ آیا ہے۔"

کپور موڈ میں آ کر سہراب مودی کی طرح بڑے تھیٹریکل مکالمے دہرا رہا تھا کچھ لمحوں کے بعد کھا کر نے بھی ایک جملہ کسا۔

"لیکن اس کے باوجود عورت کے دل کا پیار مفت ملتا ہے یا کسی قیمت پر نہیں ملتا ——"

"اس کے دل کے پیار کو کون پوچھتا ہے ——— آپ کے اس سماج میں اس کی اپنی شخصیت ہی کیا ہے ——— آپ نے اس کی خود داری اور اس کے کردار کو بالکل مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔"

کپور آج ضرورت سے زیادہ تیز تھا۔

میں نے بیرے کو پکارا ——— لیکن دوسرے ہی لمحہ ہی مجھے احساس ہوا کہ میں

نے خواہ مخواہ اتنی بلند آواز سے اسے پکارا۔ وہ ہمارے پیچھے کھڑا نہایت توجہ سے ہماری باتیں سُن رہا تھا۔

"تین چھوٹے سولن —— اور کھانے کے لیے کیا ہے۔"

اور بیرے نے رٹے ہوئے طوطے کی طرح پُوری فہرست دہرا دی۔

"صرف شامی کباب کی ایک پلیٹ۔"

"بہت اچھا صاحب —!"

بیرا تین چھوٹے پیگ اور کباب کی ایک پلیٹ ہماری ٹیبل پر رکھ کر پھر ایک طرف کھڑا ہو کر کپور کی باتوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے نہایت غیر دلچسپی سے بیرے کی طرف ایک سرسری نظر سے دیکھا۔ ادھیڑ عمر کا ہونے کے باوجود اس کا جسم سڈول اور مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ چہرہ بھرا ہُوا تھا۔ اور آنکھوں میں ذہانت اور فراست کی چمک کا احساس ہوتا تھا۔

اور کپور بولتے بولتے ایک دم رُک گیا۔ ٹھاکر نے مجھے اشارے سے بتایا کہ اب اس کی کیفیت دگرگوں ہے

"مسٹر کپور اب ہمیں چلنا چاہیئے ——" ٹھاکر نے اتنی پینے کے باوجود بڑے صاف اور شستہ لہجے میں کپور کو مشورہ دیا۔

"ہاں چلنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" کپور نے اپنی لڑکھڑاتی ہوئی مگر بلند آواز میں بہت سنجیدگی سے جواب دینے کی کوشش کی۔

"تکلف برطرف میں تو ابھی کچھ دیر بیٹھوں گا۔

"ہاں تمہارا تو راستہ بھی مختلف ہے —— خیر پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔"

کپور نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر اٹھتے ہوئے کہا۔

" گڈ بائی ـــ "

" گڈ بائی ـــ "

" آداب عرض ـــ " آداب ـــ عرض "

اور پھر کھا کر کپور کو سہارا دیتے ہوئے بار سے باہر لے گیا۔

گیارہ بج چکے تھے ـــ ڈانسنگ گرل اپنا آخری رقص ختم کر کے غالباً اپنی بقیہ رات کے لئے دس دس روپے کے تین نوٹوں کے ہاتھ سونپ کر اجنبی باہوں کے حلقے میں جا چکی تھی۔

" صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا ـــ میں نے بیرے سے کہا ـــ " بیک وقت دو پیگ لے آؤ ـــ "

اور بیرے نے میز پر ڈبل پیگ رکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا ـــ " کیوں صاحب! ـــ آپ نے کچھ نہیں کہا ـــ عورت مظلوم ہے یا ظالم ـــ آپ کا کیا خیال ہے ـــ "

اور میں بیرے کی اس بات کے جواب میں صرف مسکرا دیا۔

" آپ کے دوست تو بڑی بڑی باتیں بتا رہے تھے۔ بڑے پڑھے لکھے نظر آتے تھے ـــ لیکن ـــ "

" لیکن کیا ـــ ؟ " میں نے اسے اچانک خاموش ہوتے دیکھ کر پوچھا

" لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ عورت تو ایک پہیلی ہے ـــ "

" ہت تیرے کی ـــ " میں نے دل ہی دل میں بیرے کے اس بازاری جملے

پر ملامت کا اظہار کیا۔

" کہیں وہ مظلوم ہے — تو کہیں ظالم بھی — آپ دور کیوں جاتے ہیں اپنے محلے ہی کی بات لیجئے نا — "

اور اپنے محلے کی بات سے میں ایک دفعہ پھر چونکا۔

" میرا محلہ — " میں نے بیرے کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

" جی ہاں — آپ سروپ نگر ہی میں رہتے ہیں نا۔ بارہ نمبر گلی میں۔ "

میں نے حیرانی سے مڑ کر بیرے کی طرف دیکھا وہ نہایت سنجیدگی سے کہے جا رہا تھا۔ " آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو خوب واقف ہوں — "

بیرا کافی باتونی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ دلچسپ بھی۔ کیونکہ اس کی باتیں مجھے بور نہیں کر رہی تھیں۔

" تم مجھے کیسے جانتے ہو — " میں نے وسکی کے کچھ گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے پوچھا۔

" میں بھی تو اسی گلی میں رہتا ہوں — "

" اچھا یہ بات ہے — لیکن میں نے تمہیں وہاں کبھی نہیں دیکھا — "

" میری نوکری کا وقت ہی کچھ ایسا ہے۔ آدھی رات کو یہاں سے جانا اور پھر صبح سویرے ہی یہاں آجانا — "

" ہوں — " میں نے مسکراتے ہوئے کہا — " پھر تو بہت اچھا ہے — تم بھی بارہ نمبر گلی ہی میں رہتے ہو — "

" جی ہاں عین نکڑ پر کنوئیں کے سامنے میرا مکان ہے — ہاں تو میں آپ

سے عرض کر رہا تھا ۔ "

اور میں نے بیرے کی ادھوری بات ہی سننے کے بعد بار کی سنہری گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا ۔۔۔ "بھئی اب جلدی چلنا چاہیئے ۔ "

" آپ تانگے پر جائیں گے یا پیدل ۔ " بیرے نے پوچھا

" اس وقت اگر تانگہ مل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ پیدل چلنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ۔ یہاں سے فاصلہ زیادہ نہیں ہے ۔ "

" اگر آپ پیدل چلیں تو میں بھی آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں ؟ "

" تانگے پر کیوں نہیں ۔۔ " میں نے گلاس کو خالی کرتے ہوئے مذاق سے پوچھا

" تانگے پر بھی جا سکتا ہوں بشرطیکہ کرایہ آپ ادا نہ کریں ۔ "

" خوب ۔۔ " میں بیرے کی خود داری اور فراست پر دل ہی دل میں خوش ہوا اور پھر اسے بل لانے کا آرڈر دیدیا ۔

بل ادا کرنے کے بعد بیرے نے مجھ سے چند منٹ تک مزید رکنے کی اجازت چاہی اور پھر نہ جانے اس نے منیجر سے کیا کہا اور وہ چھٹی لے کر آ گیا ۔

ہم دونوں بار سے باہر آ گئے ۔ چاندنی رات تھی لیکن تانگے کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا ۔ قدرے توقف کے بعد ہم نے پیدل ہی چلنے کا فیصلہ کیا ۔

بیرا خاموش رہا ۔۔۔ شاید اس کی خاموشی اس وجہ سے تھی کہ بار میں بھی میں نے اس کی باتوں میں بہت کم دلچسپی لی تھی ۔ یا شاید اس لئے کہ گفتگو کے سلسلے کا آغاز میری طرف سے ہو ۔ بالآخر میں نے ہی پہل کی ۔

" بھئی تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں ۔ "

" رام دھن ــ "

رام دھن ــــ میں نے دل ہی دل میں دہرایا اور مجھے یہ نام اس وقت نہ جانے کیوں مضحکہ خیز سا لگا۔ اور اس کے بعد پھر وہی خاموشی رام دھن کے چہرے پر چھا گئی۔

میں نے پھر بے تکلف ہوتے ہوئے سوال کیا۔

" رام دھن یہاں سے کتنی رقم کما لیتے ہو ؟ "

" کمانا کیا ہے جی ــ ! بس دو وقت سوکھی روٹی مل جاتی ہے۔ "

" تمہاری شادی ہو گئی ہے ؟ " میں نے پھر ایک سوال کر مارا۔ اور اس سوال کے جواب میں کچھ دیر کی خاموشی کے بعد رام دھن کے چہرے پر سنجیدگی کی ایک ہلکی سی تہہ جم گئی۔

" نہیں جی ــ ! " وہ ایک دم جیسے جھلاتے ہوئے بولنے لگا " بھگوان کی کرپا ہے کہ میں نے شادی نہیں کی ــــ جنجال ہے جی پورا جنجال ــــ سچ پوچھو تو بابو جی مجھے تو عورت سے ہی نفرت ہو گئی ہے ... "

" عورت سے نفرت ہو گئی ہے۔ " میں نے پھر ایک حسرت آمیز نظر اس کے سنجیدہ چہرے پر پھینکتے ہوئے سوال کیا۔

" اور کیا جی ــــ سالی مرد کو بالکل موم کی ناک بنا کے رکھ دیتی ہے ــ وہ میں آپ کو شاید بار میں بھی بتانے لگا تھا اپنے محلے کا قصہ ــ "

" ہاں ــ ہاں ــــ مجھے یاد آگیا ــــ واقعی تم نے اپنے محلے کی کوئی بات شروع تو کی تھی۔ "

" ہاں میں کہہ رہا تھا کہ آپ دور کیوں جاتے ہیں اپنے محلے میں لاجونتی ہی کو دیکھ

لیجئے ۔"

" کون لاجونتی ۔ "

" ارے آپ لاجونتی کو نہیں جانتے ــــ بھولے بادشاہ ہیں آپ بھی باؤجی محلے کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے اور آپ اسے جانتے نہیں ــــ جی وہی لمبی سی تیلی سی ــــ شکنتلا کی ماں ــــ آپ کے گھر کو چھوڑ کر اس گلی میں چوتھا مکان ہے اُسکا بڑے بڑے آہنی دروازے والا ــــ "

" اچھا ــــ مکان کا تو مجھے علم ہے لیکن لاجونتی اور شکنتلا کے نام میں نے کچھ ہی سُنے ہیں ۔ "

اور میرا یہ جواب سن کر رام دھن نے قدرے تعجب اور قدرے افسوس سے میری طرف دیکھا جیسے اسے میری کم علمی اور واقفیت کی بے مائیگی پر رحم آرہا ہو۔ اس کے تیور سے پتہ چلتا تھا کہ لاجونتی کوئی معمولی اور غیر اہم عورت نہیں ہے ۔

" خیر ہوگی ــ " میں نے اس کی پوری بات سننے کی غرض سے کہا ــ " ہاں تو پھر بات کیا ہوئی ــ "

رام دھن کے کھاری اور بکھرے ہوئے چہرے پر حیرت کی لہریں بدستور کھیلتی رہیں اور وہ کہنے لگا ــــ " آپ جب لاجونتی کو نہیں جانتے تو پھر آپ کو یہ بھی علم نہیں ہوگا کہ اس نے اپنے خاوند کو چھوڑ رکھا ہے ۔ "

" اس کے خاوند نے اسے چھوڑ رکھا ہے ۔ " میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

" جی نہیں اس نے خاوند کو چھوڑ رکھا ہے ۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ لاجونتی پاگل ہے ــ بعض کہتے ہیں کہ وہ کالا جادو بھی جانتی ہے ــــ وہ پاگل ہے یا جادوگرنی

— یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اپنے خاوند کو اس نے واقعی مٹی کا مادھو بنا رکھا ہے۔"
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رام دھن اس عورت کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس کے طرز گفتگو کی وجہ سے مجھے بھی خواہ مخواہ اس عورت سے دلچسپی سی ہوگئی۔

لیکن باہر کچھ دیر تک ٹھنڈی ہوائیں چلتے چلتے وسکی کا نشہ میرے ذہن پر بُری طرح چھا گیا اور میں صرف اتنا ہی محسوس کر سکا کہ رام دھن دیر تک لاجونتی کا ذکر کرتا رہا۔ صبح جب بیدار ہوا تو رام دھن کی بہت سی باتیں میرے ذہن میں دھندلی دھندلی سی ہوکر گڈمڈ ہو چکی تھیں۔ تاہم مجھے لاجونتی کو ایک نظر دیکھنے کی تمنا ضرور پیدا ہوگئی۔ میں نے اپنی بیوی سے جب لاجونتی کا ذکر کیا تو وہ ایکدم خوفزدہ سی ہو کر کہنے لگی — " جی — لاجونتی — آپ اسے کیسے جانتے ہیں — وہ تو کالا جادو جانتی ہے کالا جادو — پورے ساٹھ دن شمشان میں جاکر اس نے پوری پوری رات منتروں کا جاپ کیا ہے — "

اور میں اپنی دقیانوسی بیوی کے دقیانوسی خیالات پر بے ساختہ قہقہہ مار ہنس دیا۔

" آپ ہنس رہے ہیں جی — محلے میں کسی عورت سے بھی پوچھ لیجئے — سب کہتی ہیں کہ وہ کالا جادو جانتی ہے اور اس نے اپنے پتی پر بھی جادو کر رکھا ہے — وہ جادو کے زور سے اس سے اپنی ہر بات منوا لیتی ہے۔"

" مگر میں نے تو سُنا ہے اس نے اپنا خاوند چھوڑ رکھا ہے — " میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

" چھوڑا تو نہیں — مگر وہ خود ہی ڈر کے مارے اس سے دُور رہنا پسند

لدھیانے کسی کالج کا پروفیسر ہے ـــــ یوں تو وہ بڑا پڑھا لکھا آدمی ہے ـــــ کرتا ہے ـــــ " مجھے اپنی سیدھی سادی بیوی کی معلومات پر حیرت ہو رہی تھی۔ اور اسی دن شام کو جب میں اپنے کمرے میں مصروفِ مطالعہ تھا۔ میری بیوی نے مجھے ایک دم اُٹھنے کے لئے کہا۔ دروازے کے پاس لے جا کر اس نے بتایا "دیکھئے وہ ـــ سامنے جو عورت آرہی ہے۔ وہی لاجونتی ہے۔"

میں نے ایک طائرانہ نظر سے اس کا جائزہ لیا۔ ہلکے سانولے رنگ کی لمبی اور دُبلی سی عورت تھی۔ عمر تیس کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ لیکن سر کے کافی بال سفید ہو چکے تھے۔ سینہ ڈھلک گیا تھا۔ لیکن چہرہ تنا ہوا اور روشن۔ اور آنکھوں میں ایک عجیب اور نامانوس سی سراسیمگی وحشت اور غصّے کی ملی جُلی کیفیت۔

" اور اس کے ساتھ کون ہے ـــــ " میں نے لاجونتی کے پیچھے پیچھے ایک سہمی سہمی اور دبلی دبکی ہوئی اکہرے بدن کی نو عمر لڑکی کو آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

" یہ لاجونتی کی لڑکی ہے نا ـــ "

" شکنتلا ـــــ "

اور میری بیوی حیرت سے میری طرف دیکھتی ہوئی بولی " اچھا تو آپ کو اس کا نام بھی معلوم ہے ـــــ "

اور میں اس کے جواب میں صرف ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہی خاموش ہو گیا۔

کچھ دن بعد اتفاق سے میں پھر کافی رات گئے گرینڈز میں پہنچا۔ پینے کے بعد رام دھن پھر میرا ہمسفر بنا۔ اور راستے میں خود ہی اس نے لاجونتی کا ذکر چھیڑ دیا۔ میری بیوی نے مجھے جو کچھ بتایا تھا میں نے بیان کر دیا اور رام دھن کو جیسے یہ جان

کر نہایت اطمینان اور مسرت کا احساس ہُوا کہ لاجونتی اب میرے لیے بھی کافی اہمیت اختیار کر چکی ہے۔

"میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ کالا جادو جانتی ہے اور اس نے تیس دن شمشانوں میں اُلٹے سیدھے منتروں کا جاپ کیا ہے لیکن آپ کی بیوی کا یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے کہ وہ اپنے خاوند سے جو کام چاہتی ہے کرا لیتی ہے ــــــ بعض اوقات تو اس نے واقعی اس سے بڑے بڑے مضحکہ خیز کام کروائے ہیں۔" ــــــ اور اس کے بعد رام دھن کا حافظہ ایک کتاب کی طرح کھل گیا اور اس نے متعدد ایسے حیرت ناک اور مضحکہ خیز واقعات سنانے شروع کر دیے جن پر اعتبار کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن رام دھن بڑے اعتماد اور وثوق سے ان کی صداقت کی ضمانت دے رہا تھا۔

مثلاً اس نے بتایا "ایک دفعہ لاجونتی نے عین اپنے گھر کے سامنے گلی میں اپنے خاوند کو جوتے لگائے۔ ناک سے لکیریں کھنچوائیں اور کئی لوگوں کے سامنے مرغا بنا کر اس کے کان پکڑوا دیئے۔

پھر اسے ایک دفعہ حکم دیا کہ تم یہاں سے بھاگتے ہوئے جاؤ اور صدر بازار کے نہال حلوائی سے میرے لئے ایک پاؤ گرم گرم جلیبیاں نکلوا کر تانگے پر بیٹھ کر فوراً یہاں پہنچو۔ اور وہ غریب سر عام واقعی بھاگتا ہوا گیا اور تھوڑی دیر بعد جلیبیوں کا لفافہ لے کر لاجونتی کے حکم کے مطابق تانگے میں واپس آگیا۔

رات رات بھر اس سے اپنی ٹانگیں دبوانا۔ کپڑے دھلوانا اور کھانا پکوانا تو لاجونتی کے محبوب مشاغل تھے۔"

"یار وہ چند بالکل پاگل ہوگا پاگل ــــــ" میں نے لاجونتی کے خاوند کے

بارے میں فیصلہ کن انداز میں کہا۔

" نہیں بابو جی! ـــــ بالکل نہیں ـــــ آپ کی بیوی کی یہ بات بھی سو فیصدی صحیح ہے کہ وہ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ لدھیانے میں انگریزی کا پروفیسر ہے۔ میں خود اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔"

" تو پھر وہ اپنی بیوی کی ہر ناجائز خواہش اور ہر ظلم کو خاموشی سے کیوں برداشت کر لیتا تھا ـــ "

" شرافت ـــ محض شرافت ـــ " اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد رام دھن اپنے آپ کہنے لگا ـــ" آپ کہہ رہے ہیں کہ لاجونتی کا خاوند پاگل ہے حالانکہ گلی کے بہت سے واقف کار لوگوں کی رائے اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور جب پروفیسر یہاں تھا تو اسے کئی دوستوں نے مشورہ بھی دیا تھا کہ لاجونتی کو پاگل خانے میں داخل کرا دو۔"

" پھر ـــــ "

" پھر کیا پروفیسر بیچارہ گلی کے دو تین اچھے اور ذمہ دار آدمیوں کو لیکر ڈرتے ڈرتے لاجونتی کو سیر کے بہانے پاگل خانے تک لے بھی آیا۔ اور جب وہاں پہنچ کر لاجونتی کو کسی طرح علم ہو گیا کہ یہ پاگل خانہ ہے اور یہ لوگ مجھے یہاں داخل کرانے کے لئے آئے ہیں تو اس نے پروفیسر کو وہیں مار مار کر ادھموا کر دیا اور ساتھ آنے والے آدمیوں کو ماں بہن کی وہ گالیاں سنائیں کہ آج تک ان کو ایک لفظ تک منہ سے نکالنے کی جرأت نہیں ہو سکی۔"

" حد ہے یار ـــ " میں نے تعجب سے کہا

اور رام دھن کہنے لگا " حد تو ہے ہی مگر بڑا ظلم بھی ہے۔ بہت ہی انیائے ہے۔

اس عورت نے تو پروفیسر کی زندگی اجیرن کر دی ہے ۔ "

مجھے واقعی پروفیسر پر رحم سا آنے لگا اور میں اداس سا ہو گیا ۔ اور اتنے میں ہم گلی کے اس موڑ تک پہنچ گئے ۔ جہاں مجھے اور رام دھن کو علیحدہ علیحدہ ہو جانا تھا ۔

لاجونتی کی شخصیت اب واقعی میرے لئے غیر معمولی طور پر اہمیت اختیار کر گئی تھی ۔ میرے اور میری بیوی کے درمیان اکثر گھر میں اسی کا ذکر رہتا ۔ بلکہ بعض اوقات تو میری بیوی بھی پریشان ہو جاتی ۔

" آخر آپ ہر وقت اسی کے نام کی مالا کیوں جپتے رہتے ہیں ۔ "

اور پھر خود ہی ہنستے ہوئے کہنے لگتی ۔ " کہیں آپ پر بھی اس کے کالے جادو کا اثر تو نہیں ہو گیا ۔ "

دن گزرتے گئے ۔ اور لاجونتی کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کردار کے تانے بانے میرے ذہن میں اور زیادہ الجھنے لگے اور میں کئی دفعہ تنہائی میں فیصلہ کرتا کہ اب لاجونتی کے بارے میں بالکل کوئی بات نہیں سوچوں گا ۔ وہ بری ہے اچھی ہے ۔ ظالم ہے مظلوم ہے ۔ پاگل ہے یا جادوگرنی ہے ۔ مجھے اس سے کیا ۔ آخر میں خواہ مخواہ اس کیلئے اپنے دماغ کو کیوں پریشان کروں ۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اس فیصلے کے باوجود میں اس کے بارے میں سوچنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ۔ جہاں کہیں اس کے معمولی سے ذکر کی بھنک بھی میرے کانوں میں پڑتی میرا ذہن چوکنا ہو جاتا ۔

اس مدت میں کئی دفعہ میں نے گلی میں اسے آتے جاتے بھی دیکھا تھا ۔ اس کے چہرے کی پتھریلی سنجیدگی کبھی پگھلنے میں نہیں آتی تھی ۔ اتنی دفعہ دیکھنے کے باوجود میں نے

کبھی اسے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ شکل و شباہت کے اعتبار سے وہ جاذب نظر اور پُرکشش تو نہیں تھی البتہ اس کے خدوخال میں اپنی سختی اور تناؤ کی وجہ سے ایک انفرادیت ضرور پیدا ہوگئی تھی۔

دن گزرتے گئے۔ مجھے کچھ ایسی نجی اور ذاتی مصروفیات اور پریشانیاں رہیں کہ میں گلی محلے اور شہر کی زندگی اور نقل و حرکت سے بہت حد تک کٹ سا گیا۔ بیوی بیمار ہوگئی۔ زیادہ تر وقت اس کی تیمارداری ڈاکٹر کو بلانے اور بھیجنے میں صرف ہوجاتا اور باقی وقت میں اپنے کمرے میں پڑھنے لکھنے میں صرف کردیتا۔

کوئی مہینہ بھر بعد جب حالات متوازن ہوئے اور بیوی پورے طور پر صحت یاب ہوگئی تو میں رات کے دس گیارہ بجے کے قریب گرینڈز میں چلا گیا۔ رام دھن مجھے دیکھتے ہی جیسے مسرت اور حیرت سے کھل سا گیا۔

"آپ ـــــ آپ تو بہت ہی دنوں بعد یہاں آئے ـــــ میں تو آپ کے گھر جاکر خیریت پوچھنے والا تھا ـــــ کہئے مزاج تو ٹھیک ہے ـــ" وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے لیکن مسرت انگیز لہجہ میں پوچھنے لگا۔

میں نے رسمی سا جواب دے کر وسکی کا آرڈر دیا۔ بہت دنوں کے بعد پینے کی وجہ سے آج نشہ میں ایک اجنبی اور نامانوس سی لذت اور والہانہ مسرت کا احساس شامل تھا۔

"کہو بھئی رام دھن! لاجونتی کا کیا حال چال ہے؟"

"بہت اچھا ہے جی ـــ بس اس کی لڑکی شکنتلا چلی گئی ہے۔"

"کہاں چلی گئی ہے؟" میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

" جانا کہاں تھا جی بیچاری نے ـــــ ماں کی ہر وقت کی جھڑکیوں اور ملامتوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا ـــــ میرا خیال ہے، اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں چلی گئی ہوگی ـــــ ویسے کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے لیکن میرا دل نہیں مانتا ـــــ وہ لڑکی بہت اچھی ہے ـــــ بڑی ہی شریف میں نے اسے کبھی نظر اٹھا کر چلتے ہوئے بھی نہیں دیکھا ـــــ " اور کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ پھر کہنے لگا ـــــ " لیکن ! کیا اعتبار اس سالی عورت ذات کا ـــــ بھگوان جانے بھاگ ہی گئی ہو کونسی بڑی بات ہے ـــــ آخر روز اخباروں میں ایسی خبریں چھپتی ہی ہیں ـــــ "

اور میں وہسکی کے گلاس کو ہاتھ میں لیکر کچھ کھو سا گیا۔ بلوری گلاس میں عنابی وہسکی کی سطح پر شکنتلا کے معصوم اور دوشیزہ خدوخال جھانک کر ڈوب جاتے " ٹھیک کہتے ہو ـــــ رام دھن ! تم ٹھیک کہتے ہو عورت ذات کا کوئی اعتبار نہیں ـــــ ! " اور مجھے اس پروفیسر کی بیچارگی اور شرافت پر رحم آنے لگا جو لدھیانے میں دن بھر انگریزی ادب کی گہرائیوں میں ڈوب کر انسانی نفسیات کے پیچ و خم واضح کرتا ہے اور رات کے اندھیرے میں اس کی نوجوان لڑکی اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے۔

عجیب بات تھی کہ اس رات میں انتہائی کوشش اور خواہش کے باوجود رام دھن سے کوئی بات نہیں کر سکا۔ بار میں تو خیر زیادہ گفتگو ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن حسب سابق جب ہم نے اپنا تمام راستہ پیدل طے کیا تو اس وقت بھی میرے سکوت کا شیرازہ منتشر نہ ہو سکا۔ حالانکہ رام دھن نے اپنی بساط کے مطابق تھوڑی

بہت کوشش بھی کی لیکن میرے گلے میں تو جیسے کوئی چیز آکر اٹک گئی تھی۔ الفاظ حلق تک آکر پھر دماغ کے کسی گوشے میں سو جاتے تھے۔

میری یہ حالت دیکھ کر رام دھن بھی اداس سا ہوگیا۔

اور اس رات کے بعد ہر رات لاجونتی کے بارے میں کوئی نہ کوئی نئی خبر سننے میں آتی درا صل پورا محلہ لاجونتی کی پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی زندگی سے دلچسپی لے رہا تھا۔

سب سے پہلے یہ معلوم ہوا۔

شکنتلا بمبئی چلی گئی ہے۔ اس کا آشنا شاید اسے کسی فلم کمپنی میں ایکٹرس بنا دے گا۔۔۔ کیونکہ اس نے اسے یہی جھانسہ دیا تھا کہ یہاں کی تلخ اور گھناؤنی زندگی نے اس کی رُوح میں جو زخم پیدا کر دیئے ہیں اور اس کی شخصیت کو جس بری طرح گھائل کر دیا ہے۔ بمبئی کا فلمی ماحول اس کی تلافی کر دے گا۔ اور وہ چند ہی دنوں میں ہندستان کی مشہور اداکارہ تسلیم کی جانے لگے گی۔

لیکن اس کے چوبیس گھنٹے بعد ایک ہولناک خبر محلے میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ شکنتلا نے جمنا میں ڈوب کر ہمیشہ کے لئے اپنا خاتمہ کر لیا ہے۔

اور پھر اس سے اگلی رات میری بیوی نے بتایا ۔۔۔۔ لاجونتی بھی صبح سے غائب ہے۔ شکنتلا کی تلاش میں نہ جانے وہ کہاں چلی گئی ہے۔

اور اس کے کچھ دن بعد یہ ٹریجڈی کامیڈی میں بدل گئی جب یہ خبر عام ہوگئی کہ ۔۔۔۔ شکنتلا دراصل لدھیانے میں اپنے پتاجی کے پاس گئی تھی اور اب تک وہیں ہے۔

"کاش یہ خبر سچ ہو۔" اور مجھے یقین تھا کہ یہ خبر سچ ہی ہوگی اور اس خبر سے

پتہ نہیں کیوں مجھے اطمینان اور مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔

اور اگلی رات جب میں گرینڈ زیں گیا تو رام دھن نے بھی اس خبر کی تائید کر دی۔

لیکن رات کو گھر تک آتے آتے راستے میں اس نے مجھے ایک نہایت عجیب اور حیرت انگیز بات بتائی۔

رام دھن کہنے لگا ـــ " مجھے نہایت معتبر ذریعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ لاجونتی شکنتلا کی تلاش میں لدھیانے جا پہنچی۔ اور جب اُسے معلوم ہوا کہ شکنتلا پروفیسر کے پاس چلی گئی ہے تو اس نے اپنے خاوند سے ملنے کی بجائے لدھیانے کے تھانے میں جا کر رپورٹ لکھوا دی کہ فلاں پروفیسر میری نوجوان لڑکی کو اغوا کر کے یہاں لے آیا ہے۔"

" ہیں ـــ " میں نے حیران ہو کر پوچھا " تو پھر کیا ہُوا ـــ "

اور رام دھن میرے اشتیاق کو بھانپتے ہوئے نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجہ میں کہنے لگا۔

" بس جی ہونا کیا تھا۔ پولیس نے رپورٹ لکھ لی اور پھر جب بات بڑھ گئی اور پروفیسر کے گھر پر چھاپہ مارا گیا اور وہاں سے واقعی شکنتلا برآمد ہو گئی تو معاملہ کی نوعیت اور بھی نازک ہو گئی ـــ "

" ہوں ـــ " میں نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

"پروفیسر نے بتایا کہ میں تو اس لڑکی کا باپ ہوں ـــ تو یہ چھنال کہنے لگی بالکل غلط ہے۔ میرا خاوند تو مدت ہوئی مر چکا ہے ـــ میں اس شخص کو بالکل نہیں جانتی ـــ "

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ـــ کیوں تمہارا کیا خیال ہے ـــ کیا ایسا ہو

سکتا ہے۔"

• ہاں وہ عورت ایسا بھی کر سکتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بات غلط نہیں ہے ۔۔۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا۔ اس کے بعد جب شہر کے معزز لوگوں اور کالج کے پرنسپل اور دوسرے پروفیسروں نے پروفیسر کی شرافت کا یقین دلایا اور شکنتلا نے خود اپنے بیان میں کہا کہ پروفیسر صاحب واقعی میرے پتا ہیں اور میری ماں کا دماغ خراب ہو چکا ہے اسی لیے وہ اول فول باتیں کرتی ہے تو معاملہ رفع دفع ہوا ۔۔"

اور عجیب بات تھی کہ اگلے دن میری بیوی نے حرف بحرف اسی طرح رام دھن کی ایک ایک بات کی تائید کردی جس طرح گذشتہ رات میری بیوی کے بیان کو رام دھن نے صحیح گردانا تھا۔

اور یہ سب باتیں محلے بھر میں پھیل چکی تھیں۔ اور راجونتی شکنتلا کے بغیر ہی تنہا لدھیانے سے واپس آگئی تھی۔

واپسی پر ایک دفعہ راہ میں گزرتے ہوئے جب اچانک میری نظر اس پر پڑی تو اس کے سنگین خدوخال میں کوئی غیر معمولی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل پہلے کی طرح سنا ہوا سنجیدہ اور ٹھوس تھا۔ اس کی زندگی کی ندی پہلے ہی کی طرح اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ بہ رہی تھی اور اس میں کسی ہلچل کے شائبہ تک کا گمان نہیں ہوتا تھا!

پورے ایک سال کے بعد آج ڈاکٹر او۔ کپور یورپ کی سیاحت سے واپس لوٹے تھے انہیں رات کو ڈنر کیلئے مدعو کرتے وقت میرے ذہن میں ایک دلکش شرارت سوجھی۔ میں نے انہیں اپنی مخصوص بار گرینڈز میں دعوت دینے کی بجائے نرملا کو منتخب کیا۔ کیونکہ وہاں

رام دھن بھی نہایت بے تکلفی کے ساتھ شریک ہو سکتا تھا۔

رام دھن نے اس رات کیلئے گرینڈز والوں سے چھٹی لے لی۔

بہت دیر تک ٹھاکر اور کپور اپنی سیاحت کے نہایت طویل تجربات اور مشاہدات بیان کرتے رہے۔ اس کے بعد میں نے ان الفاظ سے لاجونتی کا قصہ شروع کر دیا۔

" آپ دونوں اصحاب کو یاد ہوگا کہ آج سے ایک سال پہلے جس رات ہم گرینڈز میں اکٹھے ہوئے تھے ہماری زیادہ تر بات چیت عورت کی فطرت کے بارے میں ہوئی تھی اور کپور صاحب آپ کو یاد ہوگا۔ آپ نے کہا تھا کہ عورت ذات بیحد مظلوم اور ستم رسیدہ ہے۔"

" جی ہاں میں ابھی تک اپنی بات پر قائم ہوں۔"

" تو اچھا سنئے ایک ایسی عورت کا قصہ جو آپ کی عورت کے بالکل برعکس ہے۔"

اور اس کے بعد میں نے لاجونتی کے بارے میں وہ سب کچھ بیان کرنا شروع کر دیا جو میرے حافظے میں موجود تھا۔

ٹھاکر اور کپور نہایت خاموشی اور سنجیدگی سے سنتے رہے۔ اس داستان میں جب رام دھن کا ذکر آیا تو میں نے مفصل طور پر اس کا تعارف بھی کرا دیا۔ جو میری باتوں سے قطعاً بے نیاز ہو کر صرف پینے میں محو تھا۔

تمام قصہ سننے کے بعد ٹھاکر نے سخت حیرت کا اظہار کیا اور کپور ایک دم چیخ پڑا۔

" میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اس عورت کا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔"

" ہاں ایسی عورت کو (ABNORMAL) ہی کہہ سکتے ہیں۔" ٹھاکر نے بڑی متانت سے کپور کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

اور مجھے خاموش دیکھ کر رام دھن اپنی نشہ آلود آنکھوں کو نچاتے ہوئے بہکتے

بڑے اعتماد اور وقار سے بولا۔

"لیکن میں پوچھتا ہوں ــــــــ یہ عورت اگر پاگل ہے تو پاگل ہوئی کیسے؟"

"ہم تینوں پھر خاموش رہے اور کچھ دیر بعد رام دھن خود ہی کہنے لگا ـــ" میں جانتا ہوں کہ وہ پاگل کیونکر ہوئی ـــ!"

گھورا اور ٹھاکر کے علاوہ میں بھی حیرت زدہ آنکھوں سے رام دھن کی طرف دیکھنے لگا۔

"بات یہ ہے کہ پروفیسر صرف شریف ہی نہیں بلکہ نامرد بھی ہے ـ ـ"

"شرافت بجائے خود نامردی ہے ـ ـ" میں نے ہنستے ہوئے فقرہ کسا۔

"یہ تو میں جانتا نہیں ـــــ کیونکہ دیکھئے نا بابوجی ـــ !" رام دھن کی آواز بری طرح لرز رہی تھی ـــــــ "میں آپ کی طرح کوئی پڑھا لکھا آدمی تو ہوں نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ لاجونتی کا دماغ محض اس لئے خراب ہوا کہ پروفیسر سچ مچ نامرد تھا ـ ـــــــ اسی لئے شادی کے بعد پروفیسر کی اور لاجونتی کی کبھی نہیں بنی"

"تو پھر شکنتلا ــ ـ"

اور میری بات کو کاٹتے ہوئے رام دھن کہنے لگا ـــ "شکنتلا سچ مچ پروفیسر کی بیٹی نہیں ہے ـ ـ"

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ رام دھن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ واقعی سچ ہے ـ

"دراصل یہ پروفیسر کے ایک نوجوان نوکر کی بیٹی ہے ـــــــ شادی کے کچھ دنوں بعد ہی لاجونتی نے اس نوکر سے راہ و رسم پیدا کر لی تھی اور شکنتلا نے اسی نوکر کی مہربانیوں سے جنم لیا ـ ـ"

کچھ دیر تک ہماری ٹیبل پر بالکل سناٹا رہا۔ اس کے بعد ہم سب نے ایک ایک پگ اور منگوا لیا۔

اور رام دھن غٹاغٹ اسے انڈیلتے ہوئے کچھ اداس اور کچھ سنجیدہ سا ہو کر کہنے لگا ——— "بس جس دن سے یہ سالی شکنتلا پیدا ہوئی اُسی دن سے لاجونتی کے دماغ میں گڑبڑ پیدا ہو گئی ——— وہ کبھی کبھی کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ کبھی پروفیسر سے نفرت کا اظہار کرتی ——— کبھی اس نوکر کو گالیاں دیتی ——— اور کبھی خود اکیلی بیٹھی ہی آنسو بہایا کرتی ——— "

اور کپور نے لاجونتی کا تجزیہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا ——— "ہاں یہ تو ہونا تھا ——— وہ بیچاری فیصلہ نہیں کر سکی ہوگی کہ یہ گناہ جو شکنتلا کی جیتی جاگتی عورت بن کر اس کے سامنے تھا دراصل کس کا ہے ——— میرا خیال ہے اس سارے واقع سے بھی میرا بیان رد نہیں ہوتا۔ اس سے بھی عورت کی مظلومی اور بے بسی ہی ظاہر ہوتی ہے ——— "

ٹھاکر چپ رہا۔ لیکن اس کے چہرے پر کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے وہ کپور کی رائے سے متفق نہ ہو۔

اور رام دھن اپنی ہی دُھن میں کہے جا رہا تھا۔

"شروع شروع میں کئی دفعہ لاجونتی نے سوچا بھی کہ اپنی حرامی لڑکی کا گلا گھونٹ دے یا خود کسی کنوئیں میں ڈوب کر چھپا نگ لگا دے لیکن اس کے دونوں ارادے پورے نہ ہو سکے ——— اس کا مزاج بہت چڑچڑا ہو گیا۔ بات بات پر وہ پروفیسر سے اُلجھ پڑتی اور پروفیسر اپنی شرافت سے مجبور تھا۔

"تو پھر اس نوکر کا کیا ہوا ـــ "

وہ بھی اپنی مالکہ کے سلوک سے تنگ آ کر نوکری چھوڑ گیا ـــــ پھر پروفیسر کو بھی اس سے بیزار ہو کر ڈھیانے جانا پڑا لیکن ماہانہ خرچ باقاعدگی سے بھیج رہا ہے اب شکنتلا بھی چلی گئی ـــ اس عورت کے ساتھ اب کسی کی ـــــ کسی کی بھی نہیں نبھ سکتی ـ "

کافی وقت ہو چکا تھا اکثر میزیں خالی پڑی تھیں۔ ایک پُراسرار خاموشی ہر سمت پھیل پھیل کر گہری ہو رہی تھی ۔

دفعتاً مجھے ایک بات سُوجھی۔

" رام وشن ـــــ ! " میں نے اپنے گلاس کی بچی ہوئی وسکی کو پیتے ہوئے کہا ـــ "تمہیں یہ سب کچھ کیونکر معلوم ہے ـــــ یہ راز تو زیادہ سے زیادہ لاجونتی کو یا پروفیسر کو معلوم ہونا چاہیئے "

" نہیں بابوجی ! ـــ " رام وشن بالکل مدہوش ہو کر بول رہا تھا ـ

"یہ بھید صرف لاجونتی جانتی ہے یا میں ـــــ پروفیسر کو آج تک اس کی خبر نہیں ـ "

" مگر تم کیسے جانتے ہو ـــ " کپور اور ٹھاکر ایک دم پوچھنے لگے " کیوں کہ ـــ کیوں کہ ـــ " رام وشن ہکلاتے ہوئے کہہ رہا تھا " کیوں ـــ کہ ـــ جناب وہ نوکر خود میں تھا ـ "

کم بخت

دفتر کو صاف کرنے کے بعد جب وہ اپنے کوارٹر پہنچی تو پرانی کھاٹ پر کپڑوں کو بکھرا ہوا دیکھ کر ہی اس کا ماتھا ٹھنکا چھوٹے چھوٹے بچے ایک دم سہم کر اس کے ارد گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے اور دوسرے ہی لمحہ اس کا شبہ حقیقت میں بدل گیا۔ جب اس کے سب سے بڑے لڑکے بھونے بتایا کہ باپو صبح اٹھتے ہی اس ٹرنک میں گھر کے کچھ برتن ڈال کر اپنے ساتھ لے گیا ہے جو اس نے ابھی پچھلے مہینے کی پہلی تاریخ ہی کو خرید دیا تھا۔ اور ٹرنک کے سب کپڑے کھاٹ پر پھینک گیا ہے۔

گوراندتا اس سے پہلے بھی کئی بار بھاگونتی کی عدم موجودگی میں گھر کا مختلف ساز و سامان فروخت کر چکا تھا۔ اور ہر بار گوراندتا کی اس حرکت پر بھاگونتی اسے کوستی۔ طعنے دیتی۔ لڑتی جھگڑتی لیکن اس دانتا کلکل کا سلسلہ بہت زیادہ طویل نہیں بلکہ لمحاتی ہوتا تھا۔ کیونکہ بھاگونتی طبعاً بڑی حلیم اور خوش مزاج عورت تھی۔

ٹھیک آج سے سات سال پہلے شہر کے بڑے اسٹیشن کے سامنے یہ دفتر قائم ہوا تھا اور بھاگونتی اسی دن سے یہاں ملازم تھی ۔ ان سات سالوں میں اس کے مختصر سے اکہرے بدن نے ایک دو نہیں پورے چھ بچوں کو جنم دیا تھا ۔ دفتر کے اکثر کلرک اس سے دل لگی کیا کرتے تھے کہ بھاگونتی ! بھگوان کی دیا سے تمہارے گھر میں ہر سائز کا بچہ موجود ہے دفتر کے کسی دروازے سے گزرو تمہارے کسی نہ کسی بچے کے درشن ضرور ہو جاتے ہیں تم عورت نہیں ایک مشین ہو ۔

بھاگونتی ان کے مذاق پر چڑنے یا جھنجھلانے کی بجائے نہایت خندہ پیشانی سے کہہ اٹھتی " سچ کہتے ہو بابو جی ! ان کم بخت بچوں کے جھگڑے سے میں بہت تنگ ہوں مگر یہ کمبخت میرا مستک ہی کچھ ایسا ہے ۔"

اپنے نام کے بالکل برعکس "کم بخت" کا لفظ بھاگونتی کا تکیہ کلام تھا ۔ اس کی معنویت سے بے پرواہ ہو کر وہ اپنی بات چیت میں اکثر بڑی بے تکلفی اور فیاضی سے اس کا استعمال کر دیتی تھی ۔

بھاگونتی بچہ جننے کی مشین تھی یا نہیں ۔ لیکن وہ کام واقعی مشین کی طرح کرتی تھی ۔ صبح سویرے بڑے دفتر کے سب کمروں میں جھاڑو لگاتی ۔ فرش کو پانی سے دھوتی ۔ میزیں کرسیاں اور الماریاں صاف کرتی اور صبح دس بجے سے پہلے پہلے اس سرکاری فرض سے فارغ ہو کر دفتر کے ایک کونے میں اپنے مختصر سے کوارٹر میں جا کر بچوں کو نہلاتی دھلاتی پھر بازار سے سبزی ترکاری خرید کر کھانا پکاتی اور دوپہر ڈھلنے سے پہلے خانہ داری سے فارغ ہو کر پھر دفتر کے کام میں جٹ جاتی شام تک دفتر کی حاجت گاہوں اور غسل خانوں کو صاف کرنے کا سلسلہ جاری رہتا اور شام کو چھٹی ہونے کے بعد رات کا کھانا پکانے کے گورکھ

دھندے میں پھنس جاتی۔

بھاگونتی کی اس شینی قوتِ کار کا دفتر کے بعض افسروں، اکثر کلرکوں اور تقریبا
تمام چپڑاسیوں کے علاوہ دفتر کے بڑے دروازے پر پان بیچنے والی بوڑھیا اور پھلوں کا
خوانچہ لگانے والے سرحدی سردار تک کو بھی اعتراف تھا۔ لیکن گورانِدتا اس سے کبھی متاثر
نہیں ہوا تھا۔ ہونے کو تو وہ اس کے چھ بچوں کا باپ اور اس کا خاوند بھی تھا۔ لیکن
اس بندۂ خدا نے اپنی ذمہ داری کو کبھی بھول کر بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کی روزانہ
زندگی کا معمول قطعی اس کا اپنا تھا جس کا اس کے بچوں اور بھاگونتی کی مشقت سے
دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ رات کو ایک ڈیڑھ بجے سے پہلے کبھی کوارٹر میں نہیں آتا تھا۔
اور صبح کو دس بجے سے پہلے دُنیا کی کوئی طاقت اسے بیدار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کہیں کام
کاج کرنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ اس لیے کہیں ملازم نہیں تھا۔ اس حقیقت سے
سے بھاگونتی بخوبی واقف تھی۔ لیکن دن بھر وہ کیا کرتا ہے۔ اس بارے میں بھاگونتی بھی
پورے طور پر باخبر نہیں تھی۔ البتہ اُسے اتنا ضرور معلوم تھا۔ کہ گورانِدتہ کا حلقہ احباب
کافی وسیع ہے اور اس کے دوست یار بھی اس کی طرح دنیلے، ہر قسم کے عیب اور نشے
کا شکار ہیں۔ گاہے گاہے بھاگونتی کو گورانِدتا کی نقل و حرکت کے بارے میں اس
قسم کی اطلاعات بھی ملتی رہتیں۔ کہ آج وہ ریلوے اسٹیشن کے نمبرداروں کی ایک ٹولی
کے ساتھ تاش کھیل رہا ہے اور تاش کے ساتھ ساتھ جوا بھی چل رہا ہے۔ یا آج وہ
دوپہر کو کمیٹی کے کچھ چوکیداروں کے ساتھ جمنا کے کنارے چرس کے کش لگا کر گپیں
ہانک رہا تھا۔ یا آج بھنگ گھوٹ خانے میں وہ کسی اجنبی کے ساتھ لڑ پڑا یا آج صبح ہی اسے
میرٹھ کا جمعدار مل گیا تھا۔ اس لیے اسی وقت سے لطف نے کا دور چل رہا ہے۔

بہر حال ایسی کوئی رات نہیں ہوتی تھی جب گوراندا بخیریت اور بقید حواس سرِ شام ہی بال بچوں میں پہنچا ہو۔ لیکن گوراندنا کی بے راہ روی کے ساتھ بھاگونتی نے بڑی حکمرانی کے ساتھ سمجھوتہ کر رکھا تھا اپنی ازدواجی زندگی کی تلخیوں کا رونا رونے کی بجائے اپنے آپ کو وہ غیر معمولی طور پر مصروف رکھتی۔

بھاگونتی نے یہ خبر سن کر چھوٹے باہر بوڑھیا سے مرادآبادی تمباکو کا ایک پان منگوایا اور اپنے بڑے بڑے غلیظ دانتوں سے اسے چباتے ہوئے نہایت خاموشی سے کھاٹ پر بکھرے ہوئے کپڑے اکٹھے کر کے ایک جگہ رکھ دیئے اور پھر معمول کے مطابق وہ دوپہر کا کھانا پکانے میں لگ گئی لیکن بار بار اس کے دماغ میں کھدبد سی ہوتی رہی۔ اپنے انگ انگ کو وہ غیر معمولی طور پر نڈھال اور مضمحل محسوس کرنے لگی پچھلی سات راتیں گھر سے غائب رہنے کے بعد کل رات ہی گوراندنا آیا تھا۔ اور آج ہی اس نے یہ گل کھلا لیا تھا۔ .... آخر وہ کب تک یہ سب کچھ برداشت کرتی رہے گی۔ اسے اپنی زندگی بڑی بے رنگ اور اذیت ناک محسوس ہونے لگی۔ کولہو کے بیل کی طرح۔ ایک دائرے میں اندھا دھند چلتے رہو۔ چلتے رہو۔ جسم تھک کر چور چور ہو جائے۔ لیکن پھر بھی چلتے رہو۔

کوشش کے باوجود وہ روٹی نہ کھا سکی بھوک بھی جیسے اس کی انتڑیوں میں تھک ہار کر دم توڑ گئی۔ دوپہر کے بعد وہ دفتر میں آگئی۔ لیکن آج دفتر کے کام کاج میں بھی اس کا جی نہیں لگ رہا تھا اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی کونے میں چھپ کر وہ کچھ دیر تک بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے شاید اسی طرح دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے وہ خود حیران تھی۔ کہ آج اُسے کیا ہو گیا ہے۔ گوراندنا کا یہ کارنامہ

آخر کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مگر نہ جانے آج اس کی ڈھٹائی اور نکھٹوپن نے اس کے دل و دماغ کو کیوں جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی زندگی کی شوخی اور اس کے دل کے صبر کا کیوں ایک دم گلا گھونٹ دیا تھا۔

دفتر کے ٹائپ سیکشن میں کچھ لڑکیاں بھی ملازمت کرتی تھیں بھاگونتی شام کو بالعموم ان کے کمرے میں ایک آدھ گپ لڑانے کیلئے چلی جایا کرتی تھی۔ اپنی اس جھنجھلاہٹ اور اداسی کے عالم میں کام کرتے ہوئے بھاگونتی کو مسلسل یشودھا کا خیال آتا رہا۔ یوں تو ٹائپ سیکشن میں یشودھا کے علاوہ اور لڑکیاں بھی کام کرتی تھیں لیکن بھاگونتی کو یشودھا سے کچھ زیادہ ہی انس تھا۔ کیونکہ یشودھا بھی بھاگونتی کی طرح اس دفتر کے وجود میں آتے ہی یہاں ملازم ہو گئی تھی۔ اور بھاگونتی سے اس کی واقفیت دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ پرانی اور گہری تھی۔

علاوہ ازیں یشودھا کے بارے میں دفتر بھر کو یہ معلوم تھا کہ اس کے خاوند نے اسے چھوڑ رکھا ہے اور وہ اپنے علاوہ اپنی بوڑھی ماں اور اپنی کمسن اکلوتی بیٹی کی پرورش کرنے کے لئے نوکری کر رہی ہے۔ یشودھا کی زندگی کے اس پہلو نے اسے محنت شعار بھاگونتی کے اور زیادہ قریب کر دیا تھا۔ لیکن آج شام کو ٹائپ سیکشن میں آکر بھی بھاگونتی کوئی بات نہ چھیڑ سکی۔ چپکے سے ایک گوشے میں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ دماغ میں بڑے تیز تیز اور زہریلے خیالات کلبلا رہے تھے۔ لیکن کوئی خیال بھی پورے طور پر اس کے الفاظ کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے بھاگونتی! آج بڑی چپ چپ ہو؟"

یشودھا نے خود ہی چند منٹوں کے انتظار کے بعد ٹائپ کرتے کرتے ایک سرسری

سی نظر اس کی طرف پھینکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بتاؤں بی بی! ——— " ایک لمحہ کے تامل کے بعد جیسے اس کے خیالات خود بخود الفاظ میں ڈھلنے لگ گئے "یہ کمبخت تقدیر ہی کچھ ایسی ہے ——— وہ بچھو کا باپو ہے نا کمبخت ——— " اور اس مختصر سی تمہید کے بعد صبح جو کچھ اس پر گزری تھی اس نے من و عن بیان کر دی۔

" بی بی! میرا دل تو دھرم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ سامنے اسٹیشن کی لائن پر سر رکھ کے گاڑی کے نیچے آ جاؤں۔ مگر پھر جب ان چھوٹی چھوٹی جانوں کا دھیان آتا ہے۔ تو دل کی دل میں رہ جاتی ہے۔ میری آنکھ بند ہونے پر تو یہ کمبخت در در کے دھکے کھائیں گے۔ اور ان کا باپ تو انہیں پہچانے گا بھی نہیں جب میرے سامنے یہ لچھن ہیں تو میرے بعد بھگوان جانے کیا حال ہو؟ "

یشودھا بظاہر سرکاری چٹھیاں ٹائپ کرنے میں منہمک تھی لیکن حقیقت میں بھاگونتی کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سن رہی تھی۔ جب وہ اپنا دکھڑا رو چکی تو اس نے دھیرے سے کہا " بھاگونتی! عورت ذات تو پیدا ہی غلامی کے لئے ہوئی ہے مگر تم نے تو اپنے گلے میں دوہری غلامی کا جوا ڈال رکھا ہے۔ گھر والے کی غلامی اور پھر سرکار کی بھی غلامی اور پھر جب گھر والا اتنا کٹھور اور بے درد ہو تو عورت کی زندگی تو اپنے آپ اجیرن ہو جاتی ہے ——— "

یشودھا نے آخری بات کچھ اس ڈھب سے کہی جیسے ان لفظوں میں اس کی اپنی ازدواجی زندگی کی تلخی بھی سمٹ آئی ہو۔

" سچ کہا ہے بی بی ——— !" اور یہ کہتے ہوئے اسی طرح بوجھل دل کے ساتھ

بھاگونتی نے کمرے میں لٹکتی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا "پانچ بجنے میں سات منٹ رہ گئے ہیں۔ ذرا بڑے صاحب کو بھی سلام کر آؤں۔" اور وہ ٹائپ سیکشن سے نکل کر بڑے صاحب کے کمرے کے دروازے کے پاس جگت رام چپراسی کے ساتھ کھڑی ہوگئی تاکہ بڑا صاحب جب باہر نکلے تو اپنی بساط اور معمول کے مطابق وہ اپنی وفاداری کا حق ادا کر سکے۔ چھٹی ہونے کے بعد جب وہ اپنے کوارٹر میں پہنچی تو اسے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے اس کا سارا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے اور اسے بڑے زور کا بخار ہونے والا ہے۔ بڑی بے دلی کے ساتھ اس نے بچوں کے لئے کھانا پکانا شروع کیا۔ چولہے پر ابلتی ہوئی ہانڈی کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی ابلنے لگا۔ اتنے میں اس کے دو بچے آپس میں کسی بات پر لڑ پڑے۔ تو وہ اور زیادہ جھنجھلا گئی۔ اور اسی جھنجھلاہٹ میں اس نے دونوں کو پیٹ دیا۔ اور اس کی اس تلملاہٹ میں ہانڈی میں ابلتی ہوئی سبزی بھی جل گئی۔

رات ہوگئی۔ بچے کھا پی کر سو گئے۔ مگر بھاگونتی لیٹے لیٹے بہت دیر تک دل ہی دل میں اپنی حالت پر کڑھتی رہی۔ آج کئی برسوں کے بعد اس کے ٹھنڈے اور حلیم دل و دماغ میں اپنے ماحول کے خلاف نفرت اور بغاوت کے جذبات سلگنے لگے۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے اس کے اندر اب صبر کا پرانا پھوڑا ایک کر پھوٹنا چاہتا ہے بار بار اس کے دماغ میں یشودھا کی دوہری غلامی والی بات گونجنے لگتی اور وہ سوچتی کہ کاش وہ ان بچوں اور ان بچوں کے نکھٹو باپ کو جو اس کی محنت مزدوری کی کمائی ہوئی رقم جھگڑ خانوں اور شراب خانوں میں برباد کر رہا ہے۔ چھوڑ چھاڑ کر کہیں نکل جائے۔ دور نکل جائے۔ آخر اسے کیا پڑی ہے۔ کہ وہ دن رات اپنا خون جلاتی رہے اور گوارا نہ

اپنے لچے لفنگے یاروں کے ساتھ گلچھرے اڑاتا پھرے۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے ــــ اور غصے اور نفرت کی یہ تند و تیز لہریں اپنے ساتھ بہاتی ہوئی اسے دور اس بے درد اور دُکھ بھری دنیا سے بہت دور نیندوں کے سنہری جزیروں میں لے گئیں۔

ایکا ایکی وہ ہڑبڑا کر جاگ اٹھی۔ کیونکہ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر چلتا ہوا گوراندتا اس کی چارپائی سے ٹکرا کر دھم سے گر پڑا تھا بھاگونتی نے آنکھیں ملتے ہوئے حقارت سے کہا۔

" تمہارے آنے کا وقت ہو گیا کمبخت ــــ ؟ "

اور نشے میں وحشت گوراندتا نے سنبھلتے ہوئے کہا " چپ رہ کتیا ــــ "

اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ چلایا " بیماروں کی طرح کھاٹ پہ کیا لیٹی ہے۔ روٹی تیرا باپ کھلائے گا تجھے ــــ "

" روٹی نہیں میرا سر ہے ــــ یہ کھائے اسے حرام خور نکھٹو ــــ تیرے دیدوں کا پانی کیا بالکل سوکھ گیا ہے گھر میں جو چیز تجھے دکھائی دی تو نے بیچ دی۔ چھ بچوں کا باپ ہے۔ لعنتی ــــ ذرا سی حیا ہو تو ڈوب مرے ــــ "

اوے ڈوب مرے تو۔ تیری ماں۔ تیری ماں کا باپ ــــ "

بھاگونتی پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ گوراندتا کی اس خرافات نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ آپے سے باہر ہوتے ہوئے بولی " تو نکل جا کم بخت ــــ نکل جا میرے گھر سے ــــ "

اور گوراندتا کو گھسیٹتے ہوئے وہ دروازے سے باہر لے گئی۔ گوراندتا نے بھی غضبناک ہو کر اس کے بال نوچ لئے۔ اس کی قمیض پھاڑ ڈالی۔ اور گندی گندی

گالیاں دیتے ہوئے اپنے ناخنوں سے اس کے بازوؤں کو لہو لہان کر دیا۔
مگر بھاگونتی میں نہ جانے اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ کہ وہ اسے دفتر کے بڑے دروازے تک کھینچ کرلے ہی آئی۔

"کم بخت ——! میں آج یہ روز کا ٹنٹا ختم کر کے ہی دم لوں گی۔ اب دفع ہو جاؤ یہاں سے خبردار جو اس کے بعد مجھے اپنی شکل دکھائی —— یاد رکھنا اب جو تم ادھر آئے تو سیدھی تھانے میں جا کر رپٹ لکھاؤں گی ہاں ——"

"ارے کون ڈرتا ہے تیرے تھانے سے —— تھانے کی بچی —— میرا گھر ہے۔ ایک بار نہیں سو بار آؤں گا دیکھوں گا کون مائی کا لال مجھے روکتا ہے۔ ایسی تیسی تیری اور تیرے ——"

"زیادہ بکواس نہ کر کم بخت —— ورنہ ابھی لے جاؤں گی۔ تجھے اسی حالت میں بڑے گھر کی ہوا کھاتے ہی عمر بھر کے لئے تیرا نشہ ہرن ہو جائے گا ——"

"ارے! کیا بھونک رہی ہے۔ تو کیا لے جائے گی۔ میں خود تجھے لے جاتا ہوں۔"
اور وہ دونوں لڑتے جھگڑتے باہر سڑک پر چلنے لگے۔ سڑک پر کچھ مزدور اور راہ چلتے اکے دکے مسافر بھی یہ تماشا دیکھنے کیلئے ان کے پیچھے ہو لئے۔
جب وہ اسٹیشن کے چوراہے سے گزرنے لگے۔ تو اچانک ایک باوردی سپاہی کی نظر ان پر پڑ گئی۔ وہ لپک کر ان کے قریب آیا۔ "کیا بات ہے ——؟"
اور گورانداتا اپنی مدہوش آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے لڑکھڑا کر کہنے لگا
"ارے بات کیا ہونی ہے۔ یہ حرامجادی مجھ سے لڑتی ہے کھانا نہیں کھلاتی۔ گھر میں نہیں آنے دیتی۔ میں اسے تھانے میں لئے جا رہا ہوں۔ تھانے میں۔"

سپاہی نے گورا نندتا کی گردن پر زور سے جھانپڑ رسید کرتے ہوئے کہا "اچھا اب چپ رہ —— " اور پھر بھاگونتی کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے تحکمانہ لہجہ میں وہی سوال دہرایا۔

" کیا بات ہے ؟ "

" کوئی بات نہیں، کوتوال صاحب —— ! "

گورانندتا کے نشے کی بجائے بھاگونتی کا غصہ ہرن ہونے لگا

" یہ میرا گھر والا ہے ۔ ندا وار دپی کر آ گیا ہے ۔ اس لیے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے میں اسے گھر لیے جا رہی ہوں —— " بھاگونتی کے ذہن کی ابلتی ہوئی ہانڈی جیسے دفعتاً برف کی طرح سرد ہو گئی ۔ اور وہ گورا نندتا کا ہاتھ کھینچ کر واپس مڑتے ہوئے بولی ۔

" چل بے کمبخت —— اب میرا منہ کیا دیکھتا ہے ۔ ؟ "

جھوٹ

آج سرِ شام ہی کلثوم میک اپ سے فارغ ہو چکی تھی۔ انگوری رنگ کی ساڑھی اور ہلکے گلابی بلاؤز میں اسکے سیمیں جسم کا ہر زاویہ اور ہر اُبھار بوتتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھوں کی خواب ناک نشیلی جھیلوں میں ایک تبسم خود سپردگی رواں دواں تھی۔ گولڈ فلیک کے سگریٹ کا آخری کش لگا کر بچے کھچے ٹکڑے کو ٹرے میں پھینکتے ہوئے مظفر نے غیر ارادی طور پر جب کلثوم کے چہرے پر نظر ڈالی تو اسکے اپنے مرجھائے جبڑے پر ایک لمحہ کے لئے ایک وحشیانہ تبسم جھلک کر ماند پڑ گیا۔

اور کلثوم ایک دم مظفر کی طرف دیکھ کر مسکرا پڑی جیسے اس کی دلی کیفیت کو بھانپ گئی ہو۔

"دیکھو مظفر ڈیر —— !" وہ بدستور مسکراتے ہوئے مظفر سے کہنے لگی "آج اپنے نئے مہمان سے بہت محتاط ہو کر بات کرنا —— میں نے اس کشمیری نو

جوان سے کہا تھا کہ میرے شوہر ملٹری میں کیپٹن ہیں اور ان دنوں آسام گئے ہوئے ہیں۔ اور میں آج کل یہاں ۔۔۔ "

اور مظفر ایکدم بات کاٹ کر بولا

" لیکن تم نے ایسا کیوں کہا ؟ "

" کیسی عجیب آدمی ہو گیا غضب ہو گیا اتنی سی بات کہہ دینے سے "

لیکن کلثوم کی اس سیدھی سی بات نے جیسے مظفر کی کسی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا اور وہ جھنجھلا کر کہنے لگا۔

" بلا وجہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی "

" جھوٹ ـــــ ۔ کلثوم نے مظفر کے لہجہ ہی میں اس لفظ کو دہرایا جیسے کہہ رہی ہو۔ آخر اس لفظ میں کیا برائی ہے ہماری زندگی اور ہمارے کاروبار کی ساری عمارت اسی ایک لفظ پر ہی تو کھڑی ہے۔ لیکن کلثوم ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد بڑے دھیرج اور ٹھنڈے ٹھنڈے لہجہ میں کہنے لگی " میرا مطلب یہ ہے کہ تم نئے آدمی کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھنا جس سے بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ "

کلثوم نے یہ کھیل کل ہی دہلی کے ایک کافی ہاؤس میں کھیلا تھا۔ وہ کافی ہاؤس میں گئی ہوئی تھی۔ کیپٹن راجو اسے ملنے کی نیت سے لیکن وہ اپنے وعدہ کے باوجود موجود نہیں تھا اور کلثوم کی تجربہ کار اور عقابی نگاہیں کیپٹن کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخری میزوں پر ایک خوش پوش اور خوش شکل نوجوان پر مرکوز ہو گئی تھیں جو سارے کافی ہاؤس کی پر شور فضا سے کٹا ہوا بالکل تنہا نہایت بے دلی سے سگار کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔

یہیں سے یہ کھیل کھیلنے کا خیال کلثوم کے دل میں پیدا ہوا اور وہ بظاہر بڑی

بے نیازی اور بے باکی سے اس کی میز کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ سب سے پہلے اس نے بالکل رسمی انداز میں اس کے پہلو کی خالی کرسی پہ بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ پھر بیرے کو دو کافی کے پیالوں کا آرڈر دیا اور پھر بڑی سادگی اور خلوص سے اس نوجوان کو ایک پیالے کی پیش کش کی کلثوم کے اندازے کے مطابق وہ نوجوان کافی عام فہم اور شرمیلا ثابت ہوا اور کلثوم کی اس سادگی اور خلوص کے اچانک مظاہرے نے جیسے اس کے سوچنے کی قوت کو مفلوج کر دیا اور تھوڑی سی گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ کے بعد اس نے کافی کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا۔

اور کافی پیتے پیتے ہی دونوں نے ایک دوسرے سے اپنا تعارف کرایا۔ نوجوان نے بتایا کہ وہ سری نگر سے شالوں کا کاروبار کرنے کے لئے زندگی میں پہلی دفعہ دہلی آیا ہے اور یہاں ایک ہوٹل میں مقیم ہے۔ اور کلثوم اپنی مختصر سی تعارفی بات چیت ہی میں اس کی بے دلی میں کشش اور دلچسپی کا جادو جگانے میں کامیاب ہو گئی۔

وہ اس کے ساتھ اور زیادہ دیر تک بیٹھنا چاہتی تھی لیکن کیپٹن راجو کی اچانک آمد سے اس کھیل میں گڑبڑ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے اس نے مصلحتاً اس وقت ہی ملاقات پر اکتفا کیا اور آخر میں اٹھتے اٹھتے اپنا گھر کا پتہ سمجھا کر اس نوجوان کو کل شام کی چائے کیلئے مدعو بھی کر آئی۔ دعوت دیتے ہوئے اس کے لہجہ میں سادگی اور خلوص کے ساتھ اصرار بھی شامل تھا۔

کلثوم کو یقین تھا کہ وہ نوجوان یہاں ضرور پہنچے گا۔ اس وقت اس کا انتظار اس کے اندر ایک عجیب سی مسرت اور برتری کے احساس کو مہکا رہا تھا۔ لیکن مظفر اس نہک سے قطعاً بے پروا ہو کر چپ چاپ کمرے کی چھت کی کڑیاں گننے میں مصروف

تھی۔ اس "جھوٹ" والی بات سے اس کی بجھی بجھی آنکھوں کی راکھ میں ابھی تک غصے اور افسردگی کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔

"اور ہاں دیکھو ـــــ" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کلثوم نے خود ہی سلسلۂ گفتگو کا آغاز کیا "تم نیچے جاکر چائے وغیرہ کا انتظام کرواؤ گو سے چائے کے ساتھ کچھ کھانے کے لئے بھی بازار سے منگوا لینا ـــــ میرا خیال ہے تمہارے پاس کچھ پیسے تو ہوں گے ـــ"

"پیسے کہاں ہیں؟ ـــــ رات کو میرے پاس پانچ کا ایک نوٹ بچا تھا وہ بھی تم نے کیپٹن کے ساتھ کلب کی واپسی پر نشے میں تانگے والے کو دلوا دیا تھا ـــ"

"خیر کوئی بات نہیں" کلثوم نے مظفر کے لہجے کی تلخی سے گھبراتے ہوئے کہا "گو سے کہنا وہ پڑوس کی پنجابن سے میرا نام لے کر پانچ دس روپے ادھار مانگ لے ـــ کل واپس کر دیں گے۔"

اور مظفر کے نیچے چلے جانے کے بعد کلثوم نے کمرے کے منقش در و دیوار پر ایک نظر ڈالی۔ چند لمحوں کے لئے قد آدم آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ پھر پلنگ کے اطلسی بستر کی شکنیں درست کیں اور تکیے کا سہارا لیکر اس پر نیم دراز ہو گئی۔ لیٹے لیٹے وہ رگ رگ میں ہلکا ہلکا سکون محسوس کرنے لگی بے خواب آنکھوں میں غنودگی کی میٹھی میٹھی لہریں چلنے لگیں اور اسی عالم میں وہ بے خبر ہو کر سوئی رہی اس وقت تک سوتی رہی جب تک ٹیکسی کے ہارن کی آواز نے اسے ایکا ایکی چونکا دیا۔

ہارن کی آواز سن کر وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی اور ایک لمحہ کے لئے اسے اپنی اس غفلت پر افسوس کا احساس بھی ہوا کیونکہ اس طرح اچانک سو جانے سے ریشمی ساڑھی ڈھلک

گئی تھی اور خوشبو میں رچے ہوئے سیاہ گھنگریالے بال بے ترتیب ہو گئے تھے۔ وہ آئینے کے سامنے جا کر جلدی جلدی اپنے آپ کو سنوارنے لگی اور اتنے میں نیچے سے کمونے آکر اطلاع دی کہ کوئی صاحب ملنے کے لئے آئے ہیں اور کلثوم چند لمحوں تک بالوں کی لٹوں کو ٹھیک طور پر جمانے کے بعد کہنے لگی۔

"اہنیں اوپر لے آؤ نا یہاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھتے ہو ۔۔؟"

اور کچھ دیر بعد بڑے قیمتی مغربی لباس میں ملبوس اکہرے بدن کا ایک خوبصورت کشمیری نوجوان اوپر آگیا۔ کلثوم نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس سے مصافحہ کیا نوجوان سامنے کے کوچ پر بیٹھ گیا اور کلثوم پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بڑے کاروباری انداز میں چلائی

"ارے او کمو جلدی سے پان وغیرہ لا ونا ۔۔"

"اجی! ذرا دم تو لینے دیجئے پانوں کی بھی ایسی کیا جلدی ہے" کشمیری نوجوان کل کی نسبت آج کچھ بے جھجک ہو کر بات کر رہا تھا۔

"واہ جی واہ۔ بڑے لمبے سفر سے آئے ہو نا پیدل چل کر ———" اور کلثوم کی اس بات پر وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"کہئے آپ کا مزاج تو اچھا ہے۔" کلثوم نے نئے سرے سے سنجیدگی اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی نوازش ہے"

اور کلثوم کشمیری نوجوان کے اس جواب سے اپنی سنجیدگی کو اور زیادہ گہرا کرتے ہوئے بولی "دیکھئے نا ہمیں اپنی زندگی میں قدم قدم پر جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔"

"جھوٹ" نوجوان نے حیران ہو کر پوچھا

"جی ہاں جھوٹ ـــــ اب دیکھئے نا آپ نے بالکل ایسے ہی کہہ دیا ہے آپ کی نوازش ہے حالانکہ آپ کے مزاج کے سلسلے میں ابھی میری نوازش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ـــــ"

نوجوان کا شرمیلا پن یہاں پھر آڑے آ گیا اور وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ سکا

"نہیں ـ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے ـــــ" کلثوم نے نوجوان کو تشفی دینے کے لہجہ میں کہنا شروع کیا "میں نے کہا نا کہ ہمیں اکثر اوقات رسمی طور پر بھی جھوٹ بولنا پڑتا ہے ـ حالانکہ ہماری نیت بھی نہیں ہوتی اور ہم چاہتے بھی نہیں پھر بھی جھوٹ بولتے ہیں" پھر اتنا کہتے کہتے اس کی سنجیدگی ایک شریر سی مسکراہٹ میں بدلنے لگی ـ

"جی ہاں آپ سچ کہتی ہیں" نوجوان نے تائید کے طور پر سر ہلاتے ہوئے کہا ـ

"سچ ـــــ اور جھوٹ ـــــ میرا تو خیال ہے ان دونوں میں کوئی ایسا فرق بھی نہیں" کلثوم نے بھیر سکراتے ہوئے جملہ کسا اور نوجوان اس بات پر گھبرا سا گیا جیسے اس نے کلثوم سے بڑے تپے کی بات سن لی ہو ـ

اتنے میں کوپانوں کی بجائے مٹھائیوں کی پلیٹوں اور تازہ پھلوں کے ساتھ چائے کا سیٹ لے کر اوپر آ گیا ـ

"ارے آپ نے تو بڑا تکلف کیا ہے" بے ساختہ نوجوان کے منہ سے نکل گیا ـ

"تکلف کاہے کا ـــــ یہ تو آپ کا گھر ہے صاحب ـــــ" اور یہ کہتے کہتے کلثوم کے حلق سے قہقہے کی پھلجھڑی چھوٹ نکلی، مگر وہ ہنستے ہنستے یک

تحت رک گئی ۔ جیسے کمرے میں مظفر کی غصیلی آواز گونج پڑی ہو " بلا وجہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے ۔"

سچ اور جھوٹ ۔۔۔ جھوٹ اور سچ ۔۔۔ دو سپولوں کی طرح یہ لفظ اس کے دماغ میں پیچ و تاب کھانے لگے ۔

کلثوم اور وہ کچھ دیر تک چائے پیتے رہے ۔ اور اس کھانے پینے کے ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہوتی رہیں ۔ باتوں باتوں میں کلثوم نے پھر اپنی عارضی سنجیدگی کے ساتھ اپنا ذکر چھیڑ دیا ۔ وہ بتانے لگی کہ جب سے کیپٹن صاحب آسام چلے گئے ہیں اس کی شامیں بہت بے کیف گزرتی ہیں وہ شہر کے بہت ہی کم لوگوں سے گھلتی ملتی ہے ۔ اور اس شہر کے لوگ ایسے ویسے بھی کچھ زیادہ پسند نہیں ہیں ۔ کیونکہ وہ کسی کے جذبات کا بجا طور پر احترام کرنے کے قابل نہیں ہیں خواہ مخواہ بات کا تبنگڑ بنا دینا ان کے دائیں ہاتھ کا کرتب ہے اسی چیز نے اسے تنہائی پسند بنا دیا ہے ۔

وہ آپس میں باتیں ہی کر رہے تھے کہ اتنے میں مظفر بھی اپنے مخصوص لباس کی بجائے ریشمی سوٹ پہن کر اوپر آ گیا ۔ کلثوم نے مظفر کا تعارف کراتے ہوئے کشمیری نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا " یہ میرے قریبی رشتہ دار ہیں مظفر صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں ۔"

اور کشمیری نوجوان نے کوچ سے اٹھ کر اس بڑے اچھے آدمی کے ساتھ بڑی اچھی طرح مصافحہ کیا اور پھر مظفر نے جیب سے گولڈ فلیک کی نئی ڈبی میں سے ایک سگریٹ نکال کر اپنے مہمان کو پیش کیا اور اسے سلگوانے کے بعد خود کلثوم کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ کر اپنا سگریٹ جلانے لگا ۔

آپ سگریٹ کی نسبت شاید سگار زیادہ پسند کرتے ہیں ؟

کلثوم نے کشمیری کو سگریٹ کے کش لگاتے دیکھ کر کہا "ضرورت ہو تو منگوا دوں"
"سگار۔ ہاں مجھے سگار پسند ہیں لیکن اس وقت ان کی کوئی ضرورت نہیں" اور یہ
کہنے کے ایک لمحہ بعد ہی کشمیری نوجوان کے حافظے میں جیسے یکایک کسی یاد کی کرن تھرک پڑی۔
"اچھا یہ بات ہے آپ نے کل مجھے کافی ہاؤس میں سگار پیتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ جبھی تو۔۔۔
جبھی تو ـــ واللہ کیا نظر پائی ہے آپ نے۔"

اور کلثوم نے کشمیری نوجوان کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
"آپ نے واقعی مجھ پر بڑا احسان کیا ہے جو یہاں تک آنے کی زحمت فرمائی۔ آج میرا
دل کچھ غیر معمولی طور پر اداس ہے۔"

"اجی احسان کیا ـــ یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے ـــ"
کشمیری نوجوان جھینپ جھینپ کر بڑے انکسار کے ساتھ کہے جا رہا تھا "سچ
پوچھئے تو کل کی مختصر سی ملاقات ہی میں مجھے آپ کے سلوک اور آپ کی گفتگو نے بے حد
متاثر کیا ہے۔"

"عنایت ہے آپ کی ورنہ کنیز کس قابل ہے" کلثوم نے بھی انکسار کا جواب انکسار
سے دینے کے بعد کہنا شروع کیا "یہاں تو ابھی کافی گرمی ہے آپ کے سری نگر میں تو موسم
کافی خوشگوار ہوگا۔"

"جی ہاں کیا کہنے ہیں ـــ کبھی آئیے نا سری نگر میں۔"
"جی تو بہت چاہتا ہے ـــ شاید بہت جلد جانا بھی ہو۔"
"ضرور ـــ ضرور تشریف لائیے ـــ لیکن کب تک آئیں گی آپ"
"جب آپ بلائیں گے۔"

اور کلثوم کے اس جواب کو سن کر جھینپنے کی بجائے اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"غریب خانے کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں آپ کے لئے"۔

"شکریہ —" کلثوم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کا دلی میں کب تک قیام رہے گا؟" مظفر نے بھی گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے اپنے مہمان سے براہ راست سوال کیا۔

"خیال ہے کہ ابھی ہفتہ تک یہیں رکنا پڑے گا۔"

اور اس کے بعد کچھ دیر تک مظفر اور کشمیری نوجوان کے درمیان سری نگر اور سری نگر کے شاعروں کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر کمو پان لے کر آ گیا۔ اور اس نے سب کو پان پیش کرنے کے بعد جاتے جاتے بجلی کا بلب بھی روشن کر دیا جس سے شام دھندلکے میں لپٹی ہوئی کمرے کی فضا ایک دم کھلکھلا کر جگمگا سی اٹھی۔

"اوہ کافی وقت ہو گیا ہے —" کشمیری نوجوان نے اپنی کلائی کی طلائی رسٹ واچ پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا "سوا سات بج گئے ہیں۔ معاف کیجئے میں نے آپ لوگوں کا کافی وقت ضائع کیا"۔

"آپ کا خیال ہے اس جملے کے بعد آپ یہاں سے جا سکیں گے"؟ کلثوم نے مسکراتی ہوئی آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

"ابھی کچھ دیر اور رکئے — کوئی زیادہ وقت تو نہیں ہوا" مظفر بھی کلثوم کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

کشمیری نوجوان خاموش رہا۔ اور کلثوم پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔

"شاید آپ یہاں کے گھٹے گھٹے ماحول میں الجھن محسوس کرنے لگے ہیں"

" نہیں نہیں ـــــ میں بالکل ٹھیک ہوں ۔" کشمیری قدرے گھبراہٹ سے بولا۔

نہیں اس میں چھپانے کی کیا بات ہے۔ یہ الجھن تو مجھے بھی محسوس ہو رہی ہے اور آج تو ویسے بھی طبیعت نڈھال سی ہے ـــ "

" تو پھر ـــ " منظفر نے بڑے معنی خیز انداز سے سوال کیا

" جی چاہتا ہے کہ نئی دلی چلیں ۔" کلثوم نے خود ہی اپنی الجھن کا حل تجویز کیا۔

" ہاں ہاں چلیئے۔ مجھے بھی نئی دلی ہی جانا ہے۔ "کشمیری نوجوان نے اشتیاق اور مسرت سے ملے جلے لہجے میں کہا۔

" اور منظفر نے پھر اسی انداز میں پوچھا " لیکن وہاں کیا ہوگا "

" ہونا ہوانا کیا ہے ـــ " کلثوم کہنے لگی " اگر موڈ ہوا تو کچھ دیر کے لیے کسی بار میں بیٹھ جائیں گے "

کلثوم کی اس بات سے کشمیری نوجوان ایک لمحہ کے لیے چونک سا گیا۔

" کیوں آپ کو اس میں کچھ اعتراض تو نہیں ۔" کلثوم نے اس چونکاہٹ کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا اور کشمیری نے قدرے تامل سے جواب دیا " نہیں اعتراض کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے ۔"

" تو میرا خیال ہے چلیں ۔"

" چلیے ـــ "

اور وہ تینوں اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے ۔ کلثوم نے الماری میں سلولائڈ کا نیلا پرس نکال لیا

اور پھر تینوں نیچے آگئے۔

گلی کے نکڑ پر ہی انہیں خالی تانگہ مل گیا اور بیس پچیس منٹ کے مختصر سے وقفے کے بعد ہی وہ کیناٹ پلیس میں سوائے بار کے کیبن میں تھے۔

نیچے بار کے چھوٹے سے ہال میں ایک مدراسی حسینہ مصری لباس پہنے مٹک مٹک کر ناچتی ہوئی کوئی پنجابی گیت گا رہی تھی اس کے ارد گرد جیسے کئی نشہ آلود بھوکی نگاہوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا، لیکن یہ تینوں اس بے ہنگم رقص اور گیت سے بے نیاز ہو کر سکاچ کے گھونٹ حلق میں اتارنے لگے دوسرا پیگ پی لینے کے بعد ہی کلثوم کے لہجہ میں کلیاں سی چٹکنے لگیں۔ وہ چہک چہک کر بولنے لگی۔

" بھئی —— خدا کی قسم بڑے ہی دنوں کے بعد آج پینے کا مزا آ رہا ہے "

" اور سچی بات تو یہ ہے کہ پینے کا مزہ اچھی صحبت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔"

کشمیری نوجوان اور مظفر بڑی خاموشی سے تائید کے طور پر سر ہلانے لگے۔

لیکن دوسرے لمحہ بعد کلثوم بھول گئی کہ ابھی ابھی وہ کیا کہہ چکی ہے، اور پھر کچھ اس ڈھنگ سے شراب کی خوبیاں گنوانے لگی جیسے کوئی رٹا ہوا سبق سنا رہی ہو۔ کلثوم اپنی عادت کے مطابق سرور میں آ کر بولتی گئی اور مظفر اور کشمیری سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا کر حیرت کو سراہتے رہے۔ مدراسی حسینہ کا رقص ختم ہو چکا تھا۔ گیت کے بول ہال کی خاموشی کے سینے میں دفن ہو کر سو گئے تھے۔ گیارہ سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔ بار کی کرسیاں ایک ایک کر کے خالی ہو رہی تھیں بھوکی نظروں کا گھیرا ٹوٹ چکا تھا۔ کلثوم نے اپنی کیبن سے جھانک کر نیچے ہال کی طرف نظر دوڑائی اور پھر اپنے گلاس کی بچی ہوئی شراب غٹا غٹ چڑھاتے ہوئے بولی۔" میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے کافی وقت ہو چکا ہے۔"

"ہاں آپ ٹھیک فرما رہی ہیں۔" کشمیری نوجوان نے اپنی نشہ آلود آواز میں خواہ مخواہ متانت اور توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تو آپ لوگ ایک ایک پیگ تو اور لیجئے گا ——"

"نہیں اب کوئی ضرورت نہیں —— میں تو ویسے ہی اپنی مقدار سے بہت زیادہ پی گیا ہوں" کشمیری نے کہا۔

"نہیں نہیں صاحب —— ایک پیگ اور پی لینے سے کیا فرق پڑ جائے گا۔ اور پھر اس نے کسی جواب کا انتظار کئے بغیر بیرے کو آواز دیدی۔

بیرہ جب تین مختلف گلاسوں میں ایک ایک پیگ اور دے آیا تو کلثوم نے اسے بل لانے کا مطالبہ بھی کر دیا۔ اور آخری پیگ کے پینے کے دوران ہی بیرہ بل لے کر آ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے تینوں خاموش رہے اور بیرہ بھی بڑی خاموشی سے کھڑا رہا اس کے بعد کلثوم نے مظفر کے چہرے پر سوالیہ نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھا —— تو بل آ گیا"

"جی صاحب —— " بیرے نے جیسے طنز اور بار کے روایتی آداب سے ملے جلے انداز میں جواب دیا۔

"بھئی بل ادا کر دیجئے —— " کلثوم نے بڑی ہمت سے اپنی سوالیہ نظر کو الفاظ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"بل" کشمیری نوجوان بڑبڑاتے ہوئے بولا" مجھے تو علم نہیں تھا کہ یہاں آنے کی بھی نوبت آئے گی ورنہ میں انتظام کر کے آتا"

کلثوم کے چہرے پر ایک لمحہ کے لئے پریشانی کا غبار سا پھیلا لیکن دوسرے ہی

لمحہ بعد اس نے بڑے اعتماد اور وقار سے بیرے سے مخاطب ہو کر کہا: "لاؤ بل لاؤ دستخط کئے دیتی ہوں ـــــ مینجر سے بول دینا کل پے منٹ ہو جائے گی ـــ "

" ہاں کل تو بہر حال انتظام ہو جائے گا۔" کشمیری نوجوان ایک دفعہ پھر بڑبڑایا۔

اور بیرہ خاموشی سے کلثوم کے دستخط کروا کر بل واپس لے گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں لیکن بیرہ شاید واپسی پاؤں ہی پلٹ آیا۔

" کیوں کیا بات ہے ؟" کلثوم نے بیرے سے سوال کیا۔

" صاحب نہیں مانتا ۔ کیش پیسہ مانگتا ہے۔" بیرے نے جھجک جھجک کر جواب دیا۔

" لیکن میں نے دستخط جو کر دئے ہیں "

" صاحب نے بل واپس بھیج دیا ہے ـــــ بولتا ہے ہم آپ کو نہیں جانتا۔"

" ہوں نہیں جانتا ـــ کلثوم جھلاہٹ اور پریشانی میں تیز ہو کر بولنے لگی " روز کے آنے والے ہیں اور پھر بھی نہیں جانتا ـــ "

منظفر نے کھوئی کھوئی نظروں سے کلثوم کی طرف دیکھا لیکن وہ اسی لہجہ میں بیرے پر برس رہی تھی " تم ایک دفعہ پھر نیچے جاؤ۔ اور اپنے صاحب سے کہو کہ وہ خود اوپر آکر بات کرے "

" صاحب اوپر نہیں آسکتا ـ" اب کے بیرے کے لہجہ میں بھی تمکنت پیدا ہو گیا تھا۔

" ہوں ـــــ یہ بات ہے " کلثوم کے ماتھے کی لکیریں جلدی جلدی پھیلنے اور سکڑنے لگیں۔

" آپ نے اگر پہلے بتا دیا ہوتا تو میں بالکل خالی جیب کے ساتھ تو یہاں تک نہ آتا۔" کشمیری نوجوان بڑی سنجیدگی اور غصے سے کہہ رہا تھا۔ " میں بیرے کو اپنی یہ سونے کی رسٹ واچ دے دیتا ہوں ـــــ کہ کم از کم یہ ذلت میرے لئے تو ناقابل برداشت ہے "

" واقعی ناقابل برداشت ہے ـ" منظفر نے بھی بڑے رنج اور غصے سے کہا۔

"لیکن آپ گھڑی کلائی سے بندھی رہنے دیجئے۔" کلثوم نے "شیری نوجوان" کو کلائی سے گھڑی اتارتے دیکھ کر کہا "میں خود نیچے جا کر نپٹ لیتی ہوں۔"

"نہیں نہیں آپ نیچے نہ جائیے —— میرا خیال ہے منیجر نہیں مانے گا۔"

"آپ مطلقاً نہ گھبرائیے۔ میں ابھی آتی ہوں۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ لڑکھڑاتی ہوئی بیرے کے ساتھ نیچے چلی گئی۔

مظفر اور "کشمیری" کے چہروں پر ایک سہمی سہمی سنجیدگی نے اپنے پنکھ پھیلا دیئے وہ خالی خالی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے لیکن دراصل ان کی تمام توجہ کلثوم کی طرف تھی جو نیچے منیجر سے بڑے دھیمے دھیمے لہجے میں کھسر پھسر کر رہی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کلثوم کے بار بار تعارف کرانے کے باوجود منیجر اس سے ناواقفیت کا اظہار کر رہا ہے بہرحال چند منٹوں بعد کسی نہ کسی طرح کلثوم تمام معاملہ نپٹا کر اوپر آ گئی لیکن اس کے چہرے پر کوئی تلخ احساس کپکپا رہا تھا۔ جیسے کسی نے اسکے ارغوانی ہونٹوں کی مسکراہٹ پر زہر چھڑک دیا ہو۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی کچھ ایسی گھبراہٹ اور شدت سے اپنا گلاس منہ سے لگا لیا۔ جیسے سچ مچ سے اس زہریلی تلخی کو دھو ڈالنا چاہتی ہو۔

تینوں بلوری گلاس پانچویں بار پھر خالی ہو چکے تھے۔ لیکن اب کے کلثوم کو ایک ایک پیگ اور منگوانے کی جرات نہ ہو سکی اور وہ تینوں اس عالم مدہوشی میں بھی اپنے اندر ایک عجیب سا احساس ندامت لے کر چپ چاپ بار سے باہر آ گئے۔

باہر تار کول کی لمبی۔ سیاہ اور بل کھاتی ہوئی سڑک جیسے سانس روکے ہوئے لیٹی ہوئی تھی کیناٹ پلیس کی بڑی بڑی عمارتیں کسی مندر کی مورتیوں کی طرح خاموش اور ساکن و مبہوت کھڑی تھیں۔ سڑک پر دور دور تک بجلی کے ٹمٹماتے ہوئے قمقموں کے

سوا کسی انسان کی صورت نظر نہیں آرہی تھی فضا میں ایک پُراسرار خاموشی کی یندنش بھری لہریں جیسے رک رک کر بہ رہی تھیں آدھی رات کو گیناٹ پلیس ایک الف لیلوی جزیرے سے کم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"میرے خیال میں تو اب آپ بھی ہمارے ساتھ ہی چلیے" کلثوم نے باہر آتے ہی کشمیری سے کہا۔

"یہی بات میں خود آپ سے کہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ جس ہوٹل میں میرا قیام ہے وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں"

"نہیں اس وقت آپ کے ساتھ ہمارا ہوٹل میں جانا ٹھیک نہیں۔" مظفر نے بڑے کاروباری انداز میں اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"ہاں۔ ہاں مظفر صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ کوئی بات نہیں کل رات ہم آپ کے مہمان ہوں گے۔"

اور کشمیری نوجوان نے اپنے مخصوص بھولپن سے کہا۔

"تو کل ضرور آنا ہوگا۔ دیکھیے بھول نہ جائیے گا۔"

"یقیناً حاضر ہوں گے۔" مظفر نے لفظ یقیناً پر خاص طور پر زور دیا۔ اور اس کے بعد وہ تینوں تانگے پر سوار ہو گئے۔ مظفر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کلثوم اور کشمیری پچھلی سیٹ پر۔ سڑک کی کھلی ا... سرد ہوا نے کلثوم کے چیکتے ہوئے تراشیدہ بال اس کے شانوں پر بکھرا دیے اور اس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں کی طرح اب اس کا سارا جسم سرور اور مستی کے جھولے میں جھولنے لگا۔

کچھ دیر تک مظفر اور کلثوم بالکل خاموش رہے۔ کشمیری نے سوچا شاید یہ خاموشی

ہار کے ناخوش گوار حادثے کی وجہ سے ہے اس لئے اس نے کلثوم سے نہایت معذرت آمیز انداز میں کہا۔

"دیکھئے، کل میرے ہاں آنا مت بولئے آج جو کچھ ہوا ہے اس کیلئے مجھے بے حد افسوس ہے۔ آپ نے کل اگر ذرا بھی اشارہ دیا ہوتا تو میں خالی جیب نہ آتا ـــــ خیر کل تلافی ہو جائے گی ـــ"

لیکن کلثوم نہایت بے پروائی سے یہ سب سنتی رہی۔ جب کشمیری خاموش ہو ہو گیا تو وہ اپنے آوارہ بالوں کی ایک لٹ ہاتھ میں لے کر کہنے لگی۔

"دیکھئے ـــــ اِدھر دیکھئے میرے بالوں کی طرف ـــــ آج تو میں بالکل نرگس دکھائی دیتی ہوں ـــ" اور نشے میں مدہوش ہو کر اس نے اپنا ہاتھ کشمیری کے بازو پر رکھ دیا اور سرد اندھیرے میں اس نرم و نازک ہاتھ کے تھرتھراتے ہوئے لمس سے کشمیری کو یوں محسوس ہوا جیسے اس ہاتھ میں کلثوم کا دھڑکتا ہوا دل سمٹ آیا۔

کشادہ سڑکوں۔ ایک بے حد بے رونق بازار اور پھر کچھ تنگ و تاریک گلیوں سے نکل کر وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ تانگے سے اترتے ہی کلثوم نے مظفر سے کہا کہ اندر سے تانگے والے کے لئے کچھ پیسے لا دو، اور خود کشمیری نوجوان کے ساتھ بالائی منزل پر آگئی۔ کمرے کی ترتیب جوں کی توں تھی۔ چند لمحوں تک وہ خاموشی سے صوفوں پر بیٹھے بیٹھے خلا میں گھورتے رہے۔ اور پھر حفیظ نہایت خاموشی سے کھانے کے دو تھال میز پر رکھ کر واپس چلا گیا۔ دونوں نے بڑی بے دلی سے چند لقمے کھائے اور پھر کھانے کے برتن کلثوم نے میز کے نیچے رکھ دیئے۔ اور کمرے کے ماحول میں بدستور ایک گہری خاموشی سانس لیتی رہی۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد کلثوم نے بار کے مینجر کے سلوک پر تبصرہ شروع کر دیا وہ بہت جذباتی ہو چکی تھی۔ غصے اور نشے میں منیجر کو گالیاں دینے لگی اور کشمیری ٹکٹکی لگا کر اس کی موٹی موٹی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا جن میں نشے کی افراط کی وجہ سے ایک عجیب و غریب قسم کی وحشت ٹپک رہی تھی۔ لیکن کشمیری کو نہ جانے کیوں اس وقت اس سراسیمگی میں بھی ایک دل نواز اور پیار بھری کشش نظر آئی۔

"آپ یہاں بستر پر آ جائیے ـــ آرام سے بیٹھیے۔"

"اور آپ ـــ"

"میری فکر نہ کیجئے۔ میں ٹھیک ہوں ـــ"

کشمیری اس کے جواب میں کچھ کہے بغیر چپکے سے بوٹ اتار کر بستر پر لیٹ گیا۔

"مظفر صاحب کو آپ نے دیکھا ہے نا ـــ" کلثوم نے سنجیدگی کے ساتھ ایک دفعہ پھر گفتگو کا آغاز کیا۔

"جی ہاں ـــ جی ہاں ـــ اب وہ کہاں چلے گئے ـــ"

"نیچے سو گئے ہوں گے ـــ آپ نے محسوس کیا ہو گا بڑے خاموش طبع انسان ہیں ـــ"

کشمیری نوجوان پلنگ پر لیٹے لیٹے بڑی توجہ سے کلثوم کے ایک ایک لفظ کو سن رہا تھا۔

"بیچارے آج کل بری طرح پریشان ہیں ـــ"

"پریشان ہیں"، کشمیری نے حیران ہو کر پوچھا "پریشانی کس بات کی ـــ"

دیکھیے نا۔ ہر آدمی کے ساتھ کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ میرا اپنا خرچ کافی ہے۔

تاہم جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے کرنے سے گریز نہیں کرتی۔ لیکن پھر بھی مظفر صاحب مالی طور پر ضرورت مند ہی رہتے ہیں ـــ ، کلثوم خواہ مخواہ چھوٹی سی بات کو طوالت دے رہی تھی۔ آخر میں اس نے نہایت وضاحت سے اپنے مقصد کا اظہار کر دیا "اگر ہو سکے تو آپ ان کی کچھ مالی امداد ضرور کر دیجئے ـــ "

اور کلثوم کی اس بات سے کشمیری کے بھولے بھالے، شاداب اور گلنار چہرے پر ایک لمحے کے لئے ہلکی سی پریشانی کی چھاپ پڑی لیکن فوراً ہی اپنے آپ کو متوازن کرتے ہوئے اس نے کہا۔

" میں نے عرض کیا نا۔ آج تو میں کچھ بھی ساتھ لے کر نہیں آیا۔ اگر آپ فرمائیں تو چیک کاٹ دوں۔"

" نہیں نہیں۔ کوئی ایسی جلدی تو نہیں ـــ کل شام کو ہم آ جو رہے ہیں آپ کے ہوٹل میں۔"

" ہاں تو ٹھیک ہے ـــ " کشمیری نے بڑے اطمینان سے کہنا شروع کیا۔ "کل یہ آپ کے ساتھ ہوں گے ہی اس وقت میں جو بھی خدمت کر سکوں گا کر دوں گا اور ہاں سرینگر کے کچھ شال بھی تحفہ کے طور پر آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔"

" لیکن خیر یہ سب کچھ کل ہی ہو گا ـ "

" ہاں اب آرام کرنا چاہئے ـــ " یہ کہہ کر کلثوم اٹھ کر آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

" تو اب آپ ـــ " کشمیری کوئی بات کہتے کہتے رک گیا۔

" ہاں اب میں بھی آرام کرنا چاہتی ہوں " اور وہ کشمیری کے پاس ہی بستر

پر بیٹھ گئی۔

" نہ جانے کیا بات ہے ۔" کلثوم نے مسکراتے ہوئے ہونٹوں اور مسکراتی ہوئی آنکھوں سے کشمیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "نہ جانے کیا بات ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں مجھے آپ نے موہ لیا ہے۔" اور پھر اس نے اپنا سر کشمیری کے سینے پر رکھ دیا "خدا گواہ ہے میں نے زندگی میں آج تک کسی غیر مرد کے ساتھ رات بسر نہیں کی۔ لیکن نہ جانے کیا بات ہے"۔

وہ کشمیری کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ کشمیری نوجوان نے کلثوم کی اس بات کے جواب میں اس کے بھرے ہوئے گداز جسم کو اپنی بانہوں کے حلقے میں لے لیا۔

صبح کلثوم کے بیدار ہونے سے پہلے ہی کشمیری نہا دھو کر فارغ ہو چکا تھا۔ مظفر نے اسے ناشتہ وغیرہ کرنے کے لیے کافی اصرار کیا لیکن وہ نہ رکا کہنے لگا۔ ہوٹل میں کچھ بیوپاریوں کو ملنے کا وقت دے رکھا ہے تاہم جاتے جاتے اس نے مظفر کو شام کو جلد ہی پہنچنے کی تاکید کر دی اور اپنے ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر بھی نوٹ کرا دیا۔

پورے چوبیس گھنٹے بعد کلثوم پھر سر شام ہی میک اپ سے فارغ ہو گئی۔ بالکل ایک شو روم کی طرح اس نے اپنے جسم کو سجا لیا۔ مظفر نے بھی اپنے مخصوص لباس کی بجائے وہی کل کا سوٹ زیب تن کر لیا اور دونوں ٹیکسی کے ذریعے اس ہوٹل میں پہنچ گئے جہاں کشمیری نوجوان مقیم تھا۔

ہوٹل کے اندر داخل ہوتے ہی وہ منیجر کے کمرے میں چلے گئے۔ عینک کے پتلے پتلے شیشوں کے پیچھے مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ گنجی کھوپڑی کے منیجر نے انہیں تشریف رکھنے کے لیے کہا، لیکن مظفر نے کھڑے کھڑے ہی جیب سے ایک ٹیالے

سے زنگ کے کاغذ کا پرزہ نکال کر ایک لمحہ کے لئے دیکھا۔

"کیوں صاحب پینتیس نمبر کا کمرہ کس طرف ہے؟" دوسرے ہی لمحہ بعد اس نے سوال کر دیا۔

"پینتیس نمبر ــــ" عینک کے پتلے شیشوں سے ڈھکی ہوئی آنکھوں کی مسکراہٹ جیسے حیرت میں ڈوب گئی "اس نمبر کا کوئی کمرہ نہیں ہے یہاں"

"وہ جہاں وہ سری نگر کے شالوں والے کشمیری ٹھہرے ہوئے ہیں"

اور مینجر نے بدستور اسی حیرت آمیز لہجہ میں کچھ وقفوں تک سوچنے کے بعد کہا۔ "اس تمام ہوٹل میں کوئی کشمیری مسافر نہیں ہے"

مینجر کے اس جواب پر بھی کلثوم کے چہرے پہ کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی البتہ مظفر کے چہرے پر زہر آلود سنجیدگی کی دھند سی چھا گئی جس کے پیچھے شاید اس کی غصیلی اور گونجتی ہوئی آواز کلثوم سے پوچھ رہی تھی۔

"اب تبا ــــ کم بخت اب تبا ــــ میرے پاس تو اب گھر واپس جانے کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔"

"شاید آپ لوگ غلطی سے یہاں آ گئے ہیں ــــ ہوٹل کا کیا نام لکھا ہے آپ نے ــــ" مینجر اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرتا ہوا بڑے ہمدردانہ لہجہ میں پوچھ رہا تھا۔

لاجو

چکروَرتی اوشدھالیہ

دلی کے ایک ٹیڑھے میڑھے اور تنگ و تاریک کوچے سے گزرتے گزرتے اچانک ہی میری نظر پڑی۔ ایک ٹوٹے ہوئے پرانے آہنی سائین بورڈ کے یہ الفاظ کھب سے گئے۔ بے اختیار میرے قدم رک گئے اور میں نے سائین بورڈ کی طرح ہی ٹوٹے پھوٹے اوشدھالیہ کے اندر ایک جھجکتی ہوئی نگاہ ڈالی جہاں ایک قدِ آدم چوبی الماری میں مختلف سائز کی شیشیاں اور بوتلیں بے ترتیب پڑی تھیں۔

دوسرے ہی لمحہ جب اس اوشدھالیہ میں الماری کے پہلو میں رکھے ہوئے تخت پر نیم دراز ایک بھاری بھرکم اور ادھیڑ عمر کے حکیم سے ٹکرا کر میری نگاہ واپس لوٹی تو ایک دم میرے حافظے میں ہلچل سی ہوئی۔ میں نے دوبارہ بڑے غور سے حکیم کو دیکھنا شروع کیا۔ میرا شبہ یقین میں ڈھل گیا۔ اور حافظے میں ہلچل کی بجائے جیسے

ایک دم بے شمار یادوں کے چراغ جگمگا اُٹھے۔

دراصل واقعہ تقریباً دس برس پہلے کا ہے۔ دن گرمیوں کی ایک صبح تھی لاجو کی موت کے آدھ گھنٹہ بعد ہی پورے محلے میں یہ خبر عام ہو گئی تھی کہ حکم چند نے چارہ کاٹنے والے گنڈاسے سے لاجو کا سر دھڑ سے علیحدہ کر دیا ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ محلے کے ہر فرد پر حکم چند کے اس جابرانہ فعل کا ردِعمل موجود تھا۔ بچے بوڑھے اور عورتیں اپنی اپنی جگہ سب لوگ نہایت سہمی سہمی اور بڑا سرا سنجیدگی کے ساتھ اس حادثے پر قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔

جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے۔ میرا خیال ہے ہمارے محلے کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا ہولناک اور مجرمانہ سانحہ تھا کیونکہ اس محلے کے رہنے والے غیر معمولی طور پر پُرسکون اور شریفانہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔

اور پھر حکم چند خود بھی نہ صرف جسمانی اعتبار ہی سے کافی مریل اور منحنی سا انسان تھا۔ بلکہ ذہنی طور پر بھی نہایت بزدل اور ڈرپوک معلوم ہوتا تھا۔ ایسے آدمی کو تو سلیقے سے غصہ بھی نہیں آسکتا تھا کسی کو ڈھب سے گالی دینے تک کی جرات بھی اس میں مفقود تھی۔ اس قسم کی علیل و نحیف شخصیت کا یکایک ایک قاتل کی شکل میں نمودار ہونا واقعی تعجب خیز تھا۔

محلے کے عام لوگوں کی طرح میں نے بھی اس خبر کو کافی تعجب سے سُنا۔ چنانچہ اس واردات کے بعد جب پولیس تک حکم چند کے گھر آ پہنچی تو محلے کے کچھ لڑکوں کے ساتھ میں بھی حکم چند کے ہاں جا پہنچا۔

حکم چند کے گھر کے صحن میں گلی محلے کے سربرآوردہ لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔

ادھر حکم چند صحن کے عین وسط میں ایک کھاٹ پر لیٹا ہوا تھا۔ پچھلے کئی مہینوں سے وہ کسی خوفناک مرض میں مبتلا تھا۔ اس کے سکڑے سکڑے مختصر سے جسم کی سوکھی ہوئی ہڈیاں بُری طرح نمایاں تھیں۔ چہرے پر کمزوری اور نقاہت کی زردی کی ایک موٹی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے بڑے بڑے سیاہ حلقے اس زردی کو اور بھی زیادہ گھناونا بنا رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے مکروہ سے استخوانی چہرے پر صرف اس کی دو چھوٹی چھوٹی بجھی بجھی سی آنکھیں اس کے زندہ رہنے کی ضمانت دے رہی تھیں۔ ان بے نور سی آنکھوں کے پیچھے دور کہیں کسی مضبوط عزم اور زندگی کی حرکت سے پیدا شدہ جوش کی جوت بھڑک رہی تھی۔

اور حکم چند کی کھاٹ کے قریب ہی مسلح پولیس انسپکٹر لوہے کی ایک زنگ خوردہ کرسی پر بیٹھا ہوا حکم چند سے کچھ سوال کر رہا تھا۔ پولیس انسپکٹر کے علاوہ تھانے کے سپاہی اور حکم چند کے کچھ قریبی رشتہ دار بھی ایک عجیب سراسیمگی اور خوف کے جذبہ کے زیر اثر حکم چند کی کھاٹ کا گھیرا ڈالے اسے ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہے تھے۔

پولیس انسپکٹر تحکمانہ بے نیازی سے بلند آواز میں کہہ رہا تھا: "حکم چند اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ ابھی تھانے میں تحریری طور پر بیان لیا جائے گا۔"

"مجھے جو بیان دینا تھا میں دے چکا۔" حکم چند کی بجھی بجھی آنکھیں جیسے ایک دم بھڑک گئیں۔ "انسپکٹر صاحب! میرا بیان یہی رہے گا۔ آپ جہاں بھی لینا چاہیں میں یہی بیان دوں گا۔"

"لیکن —" پولیس انسپکٹر نے حکم چند کے دبلے پتلے اور بیمار جسم پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے ایک لمحہ کے تامل کے بعد نہایت سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

" لیکن اس بیان کا مطلب یہ ہے حکم چند! کہ تم اقبال کرتے ہو کہ لاجو کو تم نے ہلاک کیا ہے۔"

" بالکل ۔" حکم چند نے بڑے اطمینان سے مختصر سا جواب دیا۔

اور اس گفتگو کے بعد پولیس انسپکٹر نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا اور اس نے دفعتاً حکم چند کی پتلی پتلی باہوں کو آہنی ہتھکڑی میں جکڑ لیا۔ اور حکم چند کی ماں کے گلے سے ایک دم ایک خوفناک سی چیخ ابھر کر صحن کی سہمی سہمی فضا میں دائرے سے بنانے لگی اور اس کے بعد رونے اور چیخنے کی مسلسل آوازوں سے ایک شور سا مچ گیا۔ پولیس انسپکٹر اس چیخ چلاہٹ ہی میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ حکم چند کو تھانے کی طرف لے گیا اور ان کے پیچھے دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ میرے قدم بھی تھانے کی طرف بڑھنے لگے۔

تھانے میں پہنچ کر بھی حکم چند کے اعصاب پر کوئی غیر معمولی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ البتہ کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے وہ کسی قدر تھک ضرور گیا۔

وہاں بیان لکھنے سے پہلے پولیس انسپکٹر نے ایک دفعہ پھر بظاہر نہایت خلوص اور ہمدردی سے حکم چند کو متنبہ کرتے ہوئے کہا " دیکھو حکم چند! تمہارے اس بیان پر تمہاری زندگی اور موت کا دار و مدار ہے اچھی طرح غور کر لو۔ بعد میں کچھ نہیں ہو سکے گا ۔"

حکم چند کسی پتھر کے مجسمہ کی طرح خاموش رہا۔ اور جب پولیس انسپکٹر بیان لکھنے لگا تو اس نے پہلے کی طرح چند ہی لفظوں میں نہایت سکون اور اطمینان سے قتل کا اعتراف کر لیا۔

" حکم چند! تم نے اپنی بیوی کو ہلاک کیوں کیا ؟ ۔۔۔ "

کیوں ہلاک کیا ؟ ۔۔۔ ایک لمحہ کے لیے اس سوال پر حکم چند ٹھٹکا اور اس کے بعد اس کے زرد پتے کی طرح مرجھائے ہوئے چہرے پر نکر و تاثل کی کچھ لکیریں چھوٹی چھوٹی سپنولیوں کی طرح بل کھانے لگیں ۔

" وہ بدکار تھی ۔۔۔ بدمعاش تھی ۔۔۔ اس حرام زادی نے میرے پورے خاندان کی لٹیا ڈبو دی ۔۔۔ "

" بدکار ، تھانے دار نے زیر لب اس لفظ کو دہراتے ہوئے حکم چند کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا ۔

" جی ہاں بدکار ۔۔۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔۔۔ پرماتما کی قسم خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔۔۔ " اور اس کے بعد حکم چند کا جسم کسی سوکھی ہوئی ٹہنی کی طرح کانپنے لگا ۔ اس کے حلق کے جال میں جیسے الفاظ پھنس سے گئے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں غصے کی جوت اور زیادہ بھڑک اٹھی ۔ تھانے دار شاید اس ادھورے جملے کا بھید بھانپ گیا تھا ۔ اس نے بھی حکم چند سے مزید کچھ بتانے پر اصرار نہ کیا ۔

اس کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں آگئے ۔ لیکن اگلے دن ہمارے محلے کے علاوہ پورے شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ لاجو گاؤں کے وید چکر ورتی جی پر عاشق تھی ۔ اور حکم چند نے خود اپنی آنکھوں سے دونوں کو رنگ رلیاں مناتے دیکھا تو اس نے غیرت کے مارے لاجو کا کام تمام کر دیا ۔

لاجو اور وید جی کے تعلقات کے بارے میں کچھ اڑتی ہوئی خبریں حکم چند کے

کانوں تک پہنچتی رہتی تھیں۔ اور کسی حد تک محلے میں دبی زبانوں سے لاجو اور وید جی
تعلقات پر چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں لیکن محلے کے دوسرے سنجیدہ اور متین لوگوں
کی طرح حکم چند بھی ان خبروں کو محض افواہوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔
لیکن آدھی رات کے قریب جب اچانک حکم چند کی بوڑھی ماں کی آنکھ کھلی
تو اس نے دیکھا کہ لاجو اپنے بستر پر نہیں ہے۔ اس نے ہڑبڑا کر اسی وقت حکم چند کو
بیدار کیا اور اس طرح جس چیز کو وہ محض ایک افواہ سمجھتا تھا وہ ایک ٹھوس حقیقت
بن کر اس کے سامنے آگئی چنانچہ وہ دیوانہ وار وید جی کے قیام گاہ کی طرف لپکا جو بیک
وقت ان کے مطب اور ان کی رہائش کا کام دیتی تھی کیونکہ وہ اس وقت تک
مجرد تھے۔

اور وہاں آدھی رات کو اس نے دروازے کی درزوں میں جھانک کر جو کچھ دیکھا
وہ ایسا شرم ناک تھا جس کا اظہار کوشش کے باوجود حکم چند محلے کے دوسرے
معززین کی موجودگی میں تھانے دار کے سامنے نہیں کر سکتا تھا۔ علی الصبح جب
دبے پاؤں لاجو نے گھر میں قدم رکھا حکم چند نے اس سے کچھ پوچھے بغیر چارہ کاٹنے
والے گنڈاسے اس کا سر دھڑ سے علیحدہ کر دیا۔
اس واقعہ کی صحت میں اس لئے بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ
لاجو کے قتل ہونے کے فوراً بعد ہی سے چکر ورتی وید جی اپنے مطب کو کھلا چھوڑ کر گاؤں
سے رفو چکر ہو گئے تھے۔ اور بہت دنوں تک ان کی جستجو ہوتی رہی تھی لیکن محلہ
کا کوئی فرد بھی اس واقعہ کے بعد ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ کر سکا تھا۔
واقعہ چونکہ بے حد پرانا ہے۔ اس کی تفصیلات میرے حافظے میں جو شکل

موجود تھیں وہ میں نے تحریر کر دی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ حکم چند کو اس جرم میں کتنی سزا ہوئی تھی۔ تاہم اتنا ضرور یاد ہے کہ وہ اس مقدمے کے دوران ہی اپنی علالت اور شاید کچھ اس شدید اور خطرناک قسم کے ذہنی صدمے کی وجہ سے راہی ملک عدم ہو گیا تھا۔

اور آج اپنے حافظے میں ان بھولی بسری یادوں کے دیپ جلانے میں دلی کے ایک غیر معروف اور تنگ و تاریک کوچے میں چکرورتی اوشدھالیہ کے سامنے کھڑا تھا میں نے ایک ہی نظر میں ویدجی کو پہچان لیا تھا۔ عجیب بات تھی وقت و حالات کی اتنی کروٹوں کے باوجود ان کے چہرے پر کوئی ایسی غیر معمولی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جس سے انھیں پہچاننے میں کسی قسم کی دقت کا سامنا ہوتا۔ سوائے اس کے کہ ان کا جسم پہلے کی نسبت اور زیادہ پھیل گیا تھا۔ اور سر کے بالوں کی سیاہی دودھیا سفیدی میں بدل گئی تھی۔

"ویدجی ــــــ نمستے۔" اپنے حافظے میں انہیں یادوں کے دیپ جلانے میں چکرورتی اوشدھالیہ کے اندر چلا گیا اور ویدجی نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہوں۔ وہ میرے مرض کی تشخیص کر رہے تھے۔

"میرا خیال ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں ــــ" انھیں اس طرح منتخب دیکھ کر میں نے خود ہی بات چیت کا آغاز کیا۔

اور میری اس بات پر ویدجی کی متعجب نظروں میں یکایک جھلملاہٹ کے جگنو سے ناچنے لگے اور مجھے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ بڑے

گمبھیر ہو کر بولے ۔

" پہچان گیا ــــ تم تو بہت بدل چکے ہو بابو ۔ لیکن تمہاری آواز سے زیادہ تمہارے بھورے بالوں سے مجھے پہچاننے میں امداد ملی ــــ ۔"

ہم دیر تک اپنے ماضی کی باتیں کرتے رہے ۔ اس ماضی کی جبکہ میں اسکول میں ایک طالب علم تھا اور ویدجی کی رگوں میں جوانی کا تازہ اور چمکیلا خون دوڑ رہا تھا۔ اور دلی سے ساڑھے تین سو میل دور ایک چھوٹے سے شہر میں بھی وہ "چکر ورتی اوشد ھالیہ" کے حکیم تھے ۔

باتوں باتوں میں میں نے ویدجی سے ان کی رہائش کے بارے میں پوچھا تو وہ مسکرا کر کہنے لگے "تم تو جانتے ہو بابو! میری دوکان ہی میرے گھر کا کام دیتی ہے"
" تو گویا آپ ابھی تک ــــ کنوارے ہیں ۔"

میں نے کنوارے کا لفظ کچھ اس احتیاط سے کہا کہ ویدجی کے چہرے پر ایک شرمیلا سا تبسم لہرانے لگا "ہاں بھئی ــــ " وہ مسکراتے ہوئے بولے ۔
" ابھی تک کنوارا ہوں ۔ اور شاید اب باقی عمر بھی کنوار پن ہی میں بسر ہو گی "

مجھے ویدجی کو دیکھ کر اور ان سے باتیں کرتے ہوئے بار بار لاجو کا خیال آ رہا تھا ۔ آخر بے اختیار ہو کر میرے منہ سے نکل گیا " ویدجی لاجو ــــ وہ لاجو آپ کو یاد ہے ابھی تک ۔ "

" یاد ہے اور خوب یاد ہے بابو ــــ کبھی عورت نہیں سچ مچ کوئی دیوی تھی دیوی ۔ "

" دیوی ــــ " میں نے اپنے حافظے پر زور دیتے ہوئے ذہن ہی ذہن

میں لاجو کے قتل کی تفصیلات پر غور کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بابو ۔۔۔ تمہیں اس کے قتل کا قصّہ تو یاد ہوگا۔"

"ہاں ہاں بڑی اچھی طرح یاد ہے ویدجی!"

"لیکن اس سالے حکم چند نے بڑا پاگل پن کیا۔"

"ہاں پاگل پن تو تھا ہی ۔۔۔ لاجو کچھ بھی تھی مگر اسے قتل نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"کچھ بھی تھی ۔۔۔" ویدجی نے بڑے طنز انداز کے میرے ہی لہجہ کی نقل اتارنے کے بعد کہا "بابو میں سچ کہتا ہوں بڑی سچی اور اونچی تھی لاجو۔"

میں اس کے جواب میں چپ رہا اور ویدجی جیسے ماضی کی غم ناک یادوں کے جھرمٹ سے نکلتے ہوئے نہایت رقت آمیز لہجہ میں کہنے لگے "لاجو بالکل نردوش تھی، مگر اس سالے حکم چند کی کھوپڑی میں دماغ تو تھا ہی نہیں۔ اگر وہ آدمی کا بچہ ہوتا تو ساری عمر لاجو کے پیر دھو دھو کر پیتا۔ اب تمہیں کیا بتاؤں بابو۔۔۔ تم نے لاجو کا نام لے کر میری زندگی کے اس زخم کو ہرا کر دیا ہے۔ جسے میں دنیا بھر کی نگاہوں سے چھپاتا آیا ہوں۔"

میں بالکل سحر زدہ ہو کر چپ چاپ ویدجی کی ایک ایک بات کو نہایت انہماک سے سن رہا تھا۔

"قصور سب میرا تھا۔ میرے دل میں لاجو کے لیے کھوٹ آ گیا تھا مگر اس بیچاری کا دل شیشے کی طرح صاف تھا بابو ۔۔۔ میں بہت دنوں تک اس پر ڈورے ڈالتا رہا۔ لیکن وہ میرے جال میں نہ پھنسی اور آخر جب پھنسی تو حکم چند کی وجہ سے۔

"حکم چند کی وجہ سے ۔" میں نے ایکدم حیران ہو کر دیدی جی کی بات کاٹ دی۔
"ہاں بابو! محض حکم چند کی زندگی بچانے کے لئے وہ اپنے جسم کی قربانی دینے پر آمادہ ہو گئی۔ کیونکہ اس رات حکم چند کی دادا دارو کے لئے بھی اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اور میری عقل کی آنکھ پر جوانی کے جوش نے پٹی باندھ رکھی تھی میں نے اسے صاف صاف کہدیا تھا کہ حکم چند کو بچانے کے لئے تمہیں اپنا آپ مجھے دینا پڑے گا۔"
"تو پھر ۔۔۔" میں نے دیدی جی کو خاموش ہوتے دیکھ کر کہا۔
"تو وہ مجبور ہو کر اس رات میری جوانی کی بھوک مٹانے کے لئے میری پاس آ گئی۔ مگر نہ جانے کس آدمی نے حکم چند کے کان میں یہ خبر پھونک دی اور پھر جو کچھ ہوا وہ تمہیں معلوم ہی ہے بابو ۔۔"

اور یہ کہتے کہتے بھاری بھرکم دیدی جی کا گلا رندھ گیا اور ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے جگمگانے لگے ✣

ایک فلمی کہانی

مجھے اچھی طرح یاد ہے مسٹر ایس۔ ایس نایاب عرفانی سے میری پہلی ملاقات آج سے ٹھیک پانچ ماہ پہلے کشمیری گیٹ کے کارٹن بار میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ چند بے فکر کالجیٹ نوجوانوں میں گھرا بڑی نفاست سے سولن کی چسکیاں لیتا ہوا کسی فلم ایکٹرس کا ذکر کر رہا تھا۔

انہیں کالجیٹ نوجوانوں میں سے ایک نے جب بڑے اشتیاق سے میرا تعارف کرایا تو اس نے اپنے لمبے لمبے گھنے بالوں کو آرٹسٹک انداز میں جھٹکا دیتے ہوئے کہا: "اوہ تو آپ ہیں شاد صاحب ـــــ آپ کی نظمیں غزلیں تو میں نے اردو کے کئی پرچوں میں دیکھی ہیں ـــ" اور پھر ایک لمحے کے تامل کے بعد نہایت ہمدردانہ لہجے میں کہنے لگا: "آپ بمبئی کیوں نہیں چلے جاتے صاحب! آپ کی قسم آپ کے لئے بڑا چانس ہے۔ آپ اگر فرمائیں تو اس سلسلے میں بندہ آپ کی

کافی امداد کر سکتا ہے۔ کبھی وہ اپنی گیتا بالی جو وہاں رہے۔

پہلی ہی نظر میں وہ مجھے بہت دل چسپ آدمی نظر آیا اس کی وضع قطع اور بات چیت کا ڈھنگ بھی کم سے کم شراب خانوں کے لئے بے حد موزوں تھا میں نے اپنے بارے میں کچھ کہنا سننا تو مناسب خیال نہ کیا۔ کو اس کی باتوں سے لطف لینے کے لئے اتنا پوچھ لیا "آپ گیتا بالی کو جانتے ہیں ۔" کالج کے نوجوان مجھے حیرت اور افسوس سے دیکھنے لگے جیسے میں نے کوئی پوچ سی بات کہہ دی ہو۔

"اجی بچی ہے آپ کے نیاز مند کی شاد صاحب ۔" نایاب نے بڑی بے نیازی سے مجھے بتانا شروع کیا "میں تو اس وقت سے جانتا ہوں جب گیتا بالی گیتا بالی نہیں بلکہ ہری کیرتن کور تھی اور لاہور کے ان سرمایہ دار لاڈلی کا زیادہ وقت ایبٹ روڈ کے ایک ہوٹل میں بودزر ولڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ جن کی یہ رنگ لیڈر تھی۔ پھر اپن نے تو اس کا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب پچھلی جنگ کے دنوں میں وہ جا بجا ناچنے گانے کا مظاہرہ کیا کرتی تھی اور جب موہنی روڈ کے چند سر پھرے غنڈوں نے اس کے لواحقین کو زد و کوب بھی کیا تھا اور جب وہ شروع شروع میں شوری پکچرز کے میکلوڈ روڈ والے اسٹوڈیو میں آنے جانے لگی، اس زمانے میں تو وہ خیر ایک معمولی ناچنے والی تھی۔ لیکن پر پرزے تو اس نے اس وقت نکالنے شروع کئے جب مظہر خاں کے ساتھ وہ بمبئی چلی گئی اور وہاں ڈائرکٹر کیدار شرما کے چکر میں آ گئی۔ آج کل اس کے جملہ حقوق اگرچہ کیدار شرما کے پاس محفوظ ہیں لیکن پھر بھی آپ کے غلام کی اتنی عزت ضرور کرتی ہے کہ آپ میرا نام لیں تو آپ کے قدموں میں بچھ جائے ــــ

باقی گلاسوں کے علاوہ اب چوں کہ نایاب کا گلاس بھی خالی ہو چکا تھا۔ اس لئے

ایک نوجوان کی طرف سے سب کے لئے ایک ایک پیگ سولن کا مزید آرڈر دیا گیا اور نایاب نے مختلف ایکٹرسوں کے ان رازوں کو جو کم سے کم ہمارے لئے اب تک مخفی تھے نہایت بے تکلفی سے افشا کرنا شروع کر دیا۔ کوہ بے دماں۔ سورن لتا اور نذیر کا معاشقہ مینا کماری اور کمال امروہی کی شادی۔ نلنی جیونت اور اشوک کمار کے بے لوث تعلقات۔ پران اور کلدیپ کور کے قصے۔ غرض اس قسم کی بیسیوں کہانیاں نایاب نے کچھ ایسے لذیذ اور لہکتے ہوئے پیرائے میں بیان کیں کہ بمبئی کے کئی اسٹوڈیوز کی جیتی جاگتی تصویریں کارٹن بار کے کھلے ہال میں چلتی پھرتی محسوس ہونے لگیں اور مجھے نایاب ایک ایسی فلمی لغت معلوم ہونے لگا جس میں ہر ایکٹرس کے معنی پوری تفصیل کے ساتھ تحریر تھے اور جوں ہی کسی ایکٹرس کا ذکر آتا اس لغت کے متکلم اوراق اپنے آپ کھل جاتے تھے۔

نایاب کی مزے دار باتوں اور سولن کا دور اس وقت تک چلتا رہا جب تک بار بند نہیں ہوگئی اور یہ بتانا تو خیر ضروری نہیں کہ اسی ملاقات میں نایاب مجھ سے کافی کھل گیا اور میں اس کی من موہنی شخصیت سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا۔ ایک روز میں تنہا ہی اپنی اداسی کو شراب میں گھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک نایاب ایک دل کش خیال کی طرح نمودار ہوا۔

"ہیلو — شاد!" مجھے دیکھتے ہی اس کی بڑی بڑی ذہین اور شوخ آنکھوں میں مسرت کی چمکیلی لہر دوڑ گئی۔

میں خود بھی اس تنہا نوشی سے کسی قدر پریشان تھا۔ ایسے عالم میں نایاب کا بھرپور گرم جوشی سے استقبال کیا اور اس شغل میں اسے اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ دوسرا پیگ حلق میں اتارنے کے بعد وہ کچھ سنجیدہ اور اداس سا ہو کر کہنے لگا۔

"بار بار یہ مینا کبھی بڑی بدقسمت عورت ہے۔"

"کون مینا ——— ؟" غیر ارادی طور پر میرے موتھ سے نکل گیا۔

"ارے وہی اپنی کبھی ——— روپ کے شوری کی بیوی۔"

اور میرے کسی اور سوال کا انتظار کئے بغیر وہ کہنے لگا "بے چاری کا آج ہی خط ملا ہے بڑی پریشان ہے تمہاری قسم ———" اور اپنے گھنے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر کہنا شروع کیا "مینا واقعی مینا ہے۔ میرا مطلب ہے پنجرے کی مینا۔ اس نے ہر پنجرے کو اپنا گھر سمجھا۔ لیکن ہر شکاری نے اسے دھوکا دیا۔ تمہیں شاید اس غریب کی ہسٹری معلوم نہیں سب سے پہلے اس نے اننا مرکا سہارا لیا وہ کبھی ہرجائی نکلا دوسری بار از را میر سے نکاح کیا تو چند دنوں کے بعد وہ بھی اس کی سادہ لوحی اور معصومیت کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگا۔ اب روپ کے شوری کو اس نے اپنا سرتاج بنایا تھا تو لکھتی ہے کہ اس سے بھی دل تنگ ہوں۔"

نایاب کے سنجیدہ اور گھمبیر لب و لہجہ کے باوجود اس کی ان باتوں سے میرے دل میں مینا کے لئے کوئی ہمدردی پیدا نہ ہو سکی۔ میں نے قدرے لاپروائی سے کہا "چھوڑیئے نایاب صاحب! فلمی دنیا میں تو یہ روز کی باتیں ہیں۔ آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟"

"ٹھیک ہے آپ کسی حد تک ٹھیک کہتے ہیں شاہ صاحب! ———" وہ اور زیادہ متانت اور گھمبیرتا کے ساتھ بولنے لگا "لیکن پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں۔ مینا، منورما، کامنی کوشل۔ پدمنیا یا نگار سلطانہ نہیں ہے۔ اس جیسی وفادار عورت فلمی ایکٹرسوں میں آپ کو چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملے گی۔

اگرچہ تقدیر کی گردش کی وجہ سے اسے کئی خاوند تبدیل کرنے پڑتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے اندر کی عورت مدھو بالا سے بھی زیادہ کنواری ہے ــــــ خیر میں کمل شوری کو ایک لمبا چوڑا خط لکھوں گا۔ آدمی شریف ہے کان کھینچوں گا تو ضرور راہ راست پر آجائے گا ــــ"

اس کے بعد نایاب نے پھر فلمی ایکٹرسوں کا ذکر چھیڑ دیا اور میرا ذہن پھر فلمی نگار خانوں میں گھومنے لگا جہاں کہیں نایاب ریحانہ کے ساتھ رومان لڑا رہا ہے کہیں سہراب مودی کے ساتھ اس کی نئی فلم کے لئے کسی نئے چہرے کا انتخاب کر رہا ہے۔ کہیں راج کپور اور نرگس کی رومانی زندگی کی گتھیاں سلجھا رہا ہے۔

یا خدا یہ آدمی ہے یا فلمی دنیا کی الف لیلیٰ۔!

انہیں دنوں دہلی کے کسی سینما گھر میں ایک فلم ڈنکا چل رہی تھی اگلے دن اتوار تھا۔ مجھے دفتر سے چھٹی تھی میں نے اس کے میٹنی شو پر نایاب کو مدعو کر لیا۔

نایاب کی موجودگی نے فلم کو اور بھی پرلطف بنا دیا۔ فلمی صنعت کے بارے میں بھی اس کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ وہ فلم کے ایک ایک زاویے پر نہایت بصیرت افروز تبصرہ کر رہا تھا اور فلم کے معمولی سے معمولی کردار کا ایسا بھرپور تعارف کراتا تھا کہ اس کی روزمرہ زندگی کا ایک ایک گوشہ پوری جزئیات کے ساتھ نمایاں ہو کر نظر کے سامنے متحرک ہو جاتا تھا۔ فلم کی ہیروئن کا ذکر کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک پراسراری سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"شاد صاحب! انٹرول میں آپ کو اپنی آپ بیتی سناؤں گا ــــ" وہ دل ہی دل میں لذت کی شراب کے گھونٹ بھرتا ہوا مجھ سے کہنے لگا۔

اور انٹرول کے مختصر سے وقفوں میں اس نے بتایا "آج سے کچھ سال پہلے مجھے اپنے ایک تاجر دوست کے ساتھ آگرے جانے کا اتفاق ہوا میرا دوست گانے والے کا بہت رسیا تھا۔ چنانچہ شام کو کھانے پینے کے شغل سے فارغ ہو کر ہم نے اسی بازار کا رُخ کیا۔ ایک کوٹھے کو منتخب کیا۔ کافی رات ہم گانا سنتے رہے۔ پھر ایک دوسرے کوٹھے کا رخ کیا وہاں ہمیں دیکھ کر ایک بڑھیا نے دو تین بار نواب نواب کہہ کر پکارا جب کوئی جواب نہ ملا تو مجھے اندر لے گئی۔ اندر پلنگ پر ایک لڑکی سوئی ہوئی تھی۔ بڑھیا چلی گئی تو میں نے اس لڑکی کو بیدار کیا۔ جانتے ہو وہ لڑکی کون تھی؟" ایک دم نایاب کی باچھیں کھل گئیں "جناب — یہی آپ کی تھی"۔

فلم ختم ہونے کے بعد جب ہم جدا ہونے لگے تو نایاب نے مجھ سے میرے گھر کا پتہ پوچھ لیا۔

اور ایک شام وہ جھومتا جھکتا ہوا نہا دھو کر نہایت قیمتی سوٹ سے مزین ہو کر میرے ہاں پہنچ گیا۔

"مٹھائی کھلاؤ ——— مسٹر شاد!" مجھے دیکھتے ہی وہ دیوانہ وار ایک قہقہے کی طرح پھٹ پڑا۔

"مٹھائی کیسی بھائی۔ خیریت تو ہے"

"تمہارا کام بن گیا ——"

"میرا کام —— !" میں اور زیادہ حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

"کبھی رات کو وہ اپنا دیوانہ ملا تھا نا۔ کافی دیر تک ملاقات رہی۔ تمہاری قسم لڑکا کافی ذہین ہے۔ اچھی ترقی کرے گا۔ تمہارے بارے میں مجھے اس سے

بہت لمبی چوڑی باتیں کرنی پڑیں ـــــ میری جان تم نہیں جانتے فلمی دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اپنا ڈھول خود ہی بجانا پڑتا ہے ـــــ بہرحال میں نے ڈائرکٹر سے وعدہ لے لیا ہے کہ اس کی آئندہ فلم کے گانے تم لکھو گے، میرا مطلب ہے دہلی میں بیٹھ کر ہی لکھو گے۔ تمہیں چار سو روپیہ فی گانا دیا جائے گا ـــــ یہ گولڈن چانس ہے تمہاری قسم گولڈن چانس ـــــ اب دیر نہ کرو جلدی چلو میرے ساتھ اور اسی وقت تمہارا کنٹریکٹ ہو جائے گا ـــــ"

وہ بڑی بے تابی اور مسرت سے تیز تیز لہجے میں بول رہا تھا۔ آج تک فلمی گانے لکھنے کے بارے میں سنجیدگی سے میں نے توجہ ہی نہیں کی تھی بلکہ سوچا تک نہیں تھا لیکن آج نایاب کے ایک ایک لفظ کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔

"بس اب کچھ سوچو نہیں۔ جلدی سے میرے ساتھ چل پڑو۔ ایسا چانس قسمت سے ملتا ہے ـــــ"

اور واقعی نایاب نے مجھے سوچنے تک کی مہلت نہ دی۔ میں نے بہت اصرار کیا کہ کم از کم مجھے کپڑے ہی تبدیل کر لینے دو۔ لیکن نایاب اس وقت بجلی کی طرح مضطرب تھا مجھے اسی حالت میں گھر سے باہر کھینچ کر لے گیا۔

باہر جا کر میں نے پوچھا "جانا کہاں ہے؟"

"نئی دہلی ایمپیس میں"

"لیکن میری جیب میں تو پیسے بھی نہیں۔ بندۂ خدا کچھ روپے تو اندر سے لے آنے دو ـــ"

"روپے ـــــ ارے روپیوں کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے اپنی

جیب کو ٹٹولتے ہوئے کہا "۔۔۔۔ مگر ہاں آج اتفاق سے میری جیب بھی خالی ہے۔ اچھا جاؤ جلدی سے لے آؤ۔ دیکھو دس بیس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں لپک کر اندر گیا اور اسی سُرعت سے دس دس کے تین نوٹ جیب میں ڈال کر باہر آگیا۔

سڑک پر آتے ہی ہم نے ایک چھوٹی ٹیکسی لی اور راستہ بھر نایاب کے غیر معمولی مضطرب خدوخال دیکھ کر میں انتہائی خواہش کے باوجود دیوانند سے اس کی ملاقات کے بارے میں کوئی سوال پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

ٹیکسی سے اُتر کر نایاب نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا "تمہارے پاس گھڑی ہوگی کیا ٹائم ہے۔۔۔۔"

"چھ۔"

"او مائی گاڈ۔ ہم کافی لیٹ ہوگئے۔ مگر خیر آؤ۔۔۔۔"

ایلیپس کی نشیلی فضا میں آرکسٹرا کی رنگین تانیں لہرا رہی تھیں کچھ میزوں پر غیر ملکی سفارت خانوں کے مرد اور عورتیں محوِ نائے نوش تھے۔ لیکن دیوآنند کہیں نہیں تھا۔

پورے ماحول پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد نایاب نے کہا "ہم اتنی دیر میں ایک ایک بیئر پیتے ہیں وہ آتا ہی ہوگا۔۔"

چنانچہ ہم دونوں نے وہاں بیئر پینی شروع کر دی۔ اسی اثنا میں نایاب نے کونٹر پر جا کر ایک جگہ ٹیلی فون کیا اور پھر یک لخت اچھلتے ہوئے اس نے دبی سے مجھے پکارا۔

"سالا ٹیلی فون پر مل گیا۔ آؤ خود بات کرلو۔۔۔۔"

میں نے ٹیلی فون پر دیوانند کو آداب کیا اور اس نے جواب میں نہایت

معذرت طلب انداز میں مجھ سے کہا شاہ صاحب! میں ساڑھے پانچ بجے تک ہلیپس میں آپ لوگوں کا انتظار کرتا رہا اس کے بعد ایک ضروری کام کے سلسلے میں مجھے ذرا جانا پڑا۔ میں شاید آج بمبئی چلا جاؤں لیکن وہ بات آپ پکی سمجھے بمبئی پہنچ کر آپ کو کنٹریکٹ بھجوا دوں گا ــــ" میں نے جواب میں شکریہ ادا کیا اور ٹیلی فون کا سلسلہ کٹ گیا۔ جب میں بیر کا بل ادا کر چکا تو نایاب نے پوچھا "اب تمہارے پاس کچھ اور پیسے بھی ہیں ــــ"

"ہاں ــــــ" میں نے باقی رقم کو گنتے ہوئے کہا "بیس روپے کے قریب ہیں ــــ"

"ٹھیک ہے۔ آؤ میرے ساتھ ــــ" نایاب کا تمام اضطراب اب ایک پُرسکون نشاط میں منتقل ہو چکا تھا۔

اور میں سحر زدہ ہو کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ الپس سے نکل کر نایاب کے کہنے پر ایک وائن مرچنٹ کی دُکان سے میں نے سولن کی بوتل خریدی اور پھر نایاب نے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے مجھے دلوانند کی نئی کہانی کے گانے لکھنے کے بارے میں ضروری ہدایات دینی شروع کر دیں۔

میں بڑی توجہ سے اس کی ایک ایک بات سن رہا تھا کہ اچانک ایک زرد سی عمارت کے دروازے پر اُس نے قدم روک لئے۔

"چلو ــــ اوپر چلو ــــ"

اور میں بھی کچھ دریافت کئے بغیر اس کی قیادت میں سیڑھیاں چڑھنے لگا وہ دوسری منزل پر مجھے ایک مختصر سے کمرے میں لے گیا۔ یہاں ایک گداز بدن لیکن

عورت نے اپنے متبسم سانولے چہرے کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا ایک پراسرار اور
میٹھے کوچ پر مجھے بٹھاتے ہوئے نایاب نے کہا " یہ ہیں مس فریدا ڈنیئل ۔۔۔ اور
یہ ہیں شاد صاحب ۔ دیو آنند کی نئی فلم کے سونگ رائٹر ۔۔۔ "

سونگ رائٹر کا لفظ سن کر فریدا کی سیاہ آنکھوں میں ایک لمحہ کو عقیدت اور
مسکراہٹ کے ملے جلے جذبات جاگ پڑے ۔

" اچھا بھئی فریدا ۔ اب جلدی سے خالی گلاس لاؤ ۔ سوڈے کی ضرورت نہیں
ہے ۔ پانی ہی سے کام چل جائے گا ۔۔۔ کیوں مسٹر شاد ! "

" ہاں ہاں بالکل ۔۔۔۔۔ سوڈے کی کیا ضرورت ہے ۔ ۔ ۔ " میں
نے اس نئے ماحول میں اور زیادہ متحیر اور مسحور ہوتے ہوئے کہا ۔

اور ہم تینوں پینے لگے اور نایاب دیو آنند سے اپنی ملاقات اور میری ٹیلی فون کی
گفتگو کی روداد فریدا کو سنانے لگا نایاب کی شخصیت سے فریدا بھی میری طرح بہت
متاثر نظر آتی تھی ۔ وہیں نایاب نے بتایا کہ وہ فریدا کے بارے میں بھی دیو آنند سے
بات چیت کر چکا ہے ۔ اس فلم میں وہ بھی کوئی اہم رول ادا کر رہی ہے جس کے گانے
لکھنے کے لئے مجھ سے کہا گیا ہے ۔

جب وسکی کا نشہ اپنے جوبن پر آ گیا تو نایاب نے اپنے گھنے بالوں کو جھٹکا دیتے
ہوئے کہنا شروع کیا " مجھے یقین تھا شاد صاحب کہ آپ کے اور فریدا کے
بارے میں دیو آنند میری بات نہیں ٹال سکتا ۔ دیو آنند کچھ بھی بن جائے لیکن آپ
کے نیاز مند کا بچہ ہے ۔ میں تو اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ گورداس
پور کی گلیوں میں کھیلا کرتا تھا اور پھر لاہور میں جب وہ گورنمنٹ کالج کا اسٹوڈنٹ

تھا۔ اس وقت سے اپنا مرید ہے اور پھر ثریا سے اس کے عشق کا قصہ ـــــ آپ کی قسم شاد صاحب میں سچ کہتا ہوں کہ اگر میں اُسے نہ سمجھاتا تو اس لونڈے کو ثریا برباد کر دیتی ـــــ ثریا کے بارے میں آپ کو اتنا تو معلوم ہو گا کہ سالی بڑی رئیس اور شاہ دل چھوکری ہے ـــــ"

اور اس کے بعد ثریا کے معاشقوں کی بات چل نکلی اور نایاب بتلانے لگا

"فلم شار دنیا کا کھجائی شہزادہ افتخار رہے نا۔ ان دنوں پاکستان میں ہے سب سے پہلے ثریا نے اسی کو اپنے جال میں پھانسا تھا اور اس کے بعد اس کی نظر دلیپ آنند پر پڑی۔ مگر ان نے بھی دلیپ آنند کو وہ سبق پڑھایا کہ اب سالی ثریا ساری عمر کسی سے آنکھ لڑانے کا نام نہیں لے گی ـــــ"

نایاب صاحب! آپ اتنی فلمی معلومات کے مالک ہیں ـــــ آپ ان ایکٹرسوں کے متعلق کوئی کتاب کیوں نہیں لکھتے ـــــ خدا کی قسم بے نظیر کتاب ہو گی"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے شاد صاحب ـــــ" نایاب نے سنجیدگی سے کہنے لگا "اگر زندگی نے فرصت دی تو آپ کی قسم ایک ناول لکھوں گا ایک طویل ناول جو پورے ہندوستان کی فلمی تاریخ کو چونکا کے رکھ دے گا۔ میری زندگی کا تو ایک ایک دن کسی نہ کسی اہم فلمی واقعے سے متعلق ہے"

کافی رات گزر چکی تھی۔ نایاب اور فریدا کی نقل و حرکت سے معلوم ہو رہا تھا کہ آج رات کے لئے نایاب اسی کے پاس ٹھہرے گا۔ اس لئے میں نے کچھ دیر کے بعد ان سے رخصت چاہی۔ نایاب نے اگلے دن مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا اور میں رخصت ہو گیا۔

اگلے دن میں نایاب کا منتظر رہا لیکن وہ نہ آیا۔ بلکہ اس کے بعد آج تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس کا ٹھور ٹھکانا مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ فریدا کی قیام گاہ تک جاتے وقت نایاب کی باتوں اور واپسی پر شراب کا نشہ تھا۔ اس لئے وہاں بھی نایاب کی مدد کے بغیر پہنچنا ناممکن تھا۔

لیکن کل اتفاق سے باتوں ہی باتوں میں اپنے ایک فلمی جرنلسٹ دوست سے جو ایک فلمی ہفت روزہ کی ادارت کے علاوہ ایک مشہور ڈسٹی بیوٹر کے ہاں اشتہار نویس کی ملازمت بھی کرتے ہیں۔ میں نے دیوانند سے ٹیلی فون پر اپنی ملاقات کا ذکر کیا تو انھوں نے حیران ہو کر پوچھا "تو کیا آپ نے اسے بمبئی ٹیلی فون کیا تھا ــــ"

"نہیں یہیں دلی سے ــــ"

"تو کیا وہ دلی میں تھا ــــ آپ کب کی بات کر رہے ہیں؟"

"ابھی پچھلے مہینے کا ذکر ہے"

اور میرے جرنلسٹ دوست کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ناممکن ــــ قطعی ناممکن ــــ پچھلے ایک سال سے تو دیوانند یہاں آیا ہی نہیں"

نہیں حضور میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ــــ میرے ایک دوست نایاب بھی میرے ساتھ تھے انھوں نے تو اس سے ملاقات بھی کی تھی ــــ"

"کون نایاب ــــ کہیں ایس۔ ایض نایاب تو نہیں ــــ"

"جی ہاں وہی آپ ان سے واقف ہیں ــــ"

"اجی خوب واقف ہوں اس فراڈ سے ــــ"

"فراڈ ــــ؟" میں نے تعجب سے پوچھا

"بہت بڑا فراڈ ——" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا: "حال ہی ایک اغوا کے کیس میں انبالہ جیل سے پانچ سال کے بعد رہا ہو کر یہاں پہنچا تھا۔ اور اب پھر نئی دہلی کی ایک کرسچین چھوکری کو اغوا کرنے کے جرم میں زیرِ حراست ہے —"

"کب سے —؟" میں نے ہکا بکا ہوتے ہوئے پوچھا

"میرے خیال میں چھ سات دن سے زیادہ کی بات نہیں"

پندرہ روپے کے لئے

کافی کے گرم گرم میٹھے گھونٹ حلق میں اتارنے کے بعد افسانہ نگار ہریش نے چار مینار کا سگریٹ سلگا کر پہلا ہی کش لگایا۔ تو اس کے تھکے تھکے زرد چہرے پر سکون اور طمانیت کی ٹھنڈی ٹھنڈی گلابی لہریں دوڑنے لگیں جیسے طویل سفر کے بعد کوئی تھکا ہوا راہی اپنی منزل کے سایہ دار شجر کے تلے دم لے رہا ہو۔

"یار! یہ شراب بھی عجیب چیز ہے۔"

سکون و اطمینان کی لہروں میں ہلکے ہلکے تبسم کے ننھے منے چراغ ٹمٹما اٹھے اور اس کی ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے اس کے خوش فکر نوجوان ساتھی جیسے ایک دم گہری نیند سے چونک اٹھے۔ کافی ہاؤس کی پرشور فضا میں کافی پیتے پیتے اچانک شراب کا ذکر کرنا واقعی چونکا دینے والی بات تھی۔

"ابھی کچھ دنوں کی بات ہے" ہریش نے اپنے دوستوں کے متحیر چہروں پر

ایک شیمیں سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا : خاکسار کی جیب میں پیسے بھی تھے اور دل میں شراب پینے کی خواہش بھی۔ لیکن بھئی! مصیبت یہ ہے کہ میں تنہا نوشی سے بہت گھبراتا ہوں۔ اکیلے پینے کے تصور ہی سے مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔ جیسے شراب کی بجائے کوئی کڑوی دوائی پی رہا ہوں۔ شراب میرے نزدیک ایک مجلسی چیز ہے ۔

" تو کیا آج ہمیں شراب پر کوئی لیکچر پلانے کا ارادہ ہے ؟ " ہریش کے پہلو میں بیٹھے ہوئے زتشی نے اکتاتے ہوئے پوچھا۔

لیکن ہریش جیسے آج اکسی طرح پریشان ہونے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ اس نے زتشی کے شانے پر اپنے بازو کو پھیلاتے ہوئے کہا۔

" ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں ۔۔۔ مگر ذرا صبر کر میری جان! میں شراب کے ساتھ ساتھ اس چیز کا بھی ذکر کرنے والا ہوں جو تیرے اعصاب پر شراب کے نشے کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا مجھے کسی ہم پیالہ کی تلاش تھی۔ تم لوگ یقین نہیں کرو گے اس روز میں شام کے ساڑھے چھ بجے تک کافی ہاؤس میں بور ہوتا رہا۔ لیکن یہاں کوئی کام کا آدمی نہیں آیا۔ پھر رات کے دس بجے تک کناٹ پلیس کے تین مختلف باروں میں میں نے سولن کے تقریباً پانچ بڑے پیگ پئے ہوں گے۔ لیکن تینوں شراب خانوں میں ایک بھی یار طریقت نظر نہیں آیا ۔

ہریش سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے ایک طویل کش لگا کر پھر بولنے لگا : اس کے بعد میں بیزار ہو کر بے اختیار اور بے مقصد کناٹ پلیس میں گھومنے لگا۔ بجلی کے خاموش قمقمے جابجا جگمگا رہے تھے۔ لیکن سیاہ سڑکیں سنسان تھیں۔ بالکل میرے دل و دماغ کی طرح جہاں سولن کے پانچ پیگوں کے سردار نے اپنے نورانی تنبھ تو

بکھا دیئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تنہائی کے احساس کو اور زیادہ گہرا اور شدید کر دیا تھا۔

چلتے چلتے اچانک میں نے دیکھا کہ میرے آگے ہلکے سُرخ رنگ کی ساری پہنے ہوئے ایک دراز قد دُبلی پتلی خاتون بھی چل رہی ہے جس کے ہاتھ میں سلولائڈ کا پرس بھی لٹک رہا تھا۔" اور ہریش اتنا کہہ کر ایک لمحے کے لیے کنکھیوں سے زنشی کی طرف دیکھنے لگا۔ ہریش کو زنشی کی طرف متوجہ دیکھ کر آنند اور کمار بھی اُسے دیکھنے لگے اور اپنے آپ کو سب کا مرکز نگاہ بنتے دیکھ کر زنشی کے سفید، بے داغ اور کشمیری چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

" لباس سے وہ خاصی پڑھی لکھی اور کسی متمول گھرانے کی عورت معلوم ہوتی تھی" ہریش نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔" اور اُس کی چال میں بالکل شہزادیوں کا سا بانکپن تھا کچھ اس بے نیازی سے چل رہی تھی جیسے کیناٹ پلیس کی تمام سڑکیں اُس کی ذاتی ملکیت ہوں اور ان سڑکوں کے ایک ایک زاویے اور خم کو وہ اپنی برتری اور ملکیت کا احساس دلا رہی ہو۔ ایک موڑ پر جب میں نے اُس کے چہرے کی جھلک دیکھی تو اس کا تعاقب کرنے کی خواہش اور بھی تیز ہو گئی۔ شکل و صورت بھی کافی جاذب نظر تھی۔ کچھ دیر تک نہایت خاموشی سے میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اور جب کیناٹ پلیس کے اندر کے دائرے کے ارد گرد پورا چکر کاٹنے کے بعد وہ اسی طرح بے نیازی سے چلتی رہی تو مجھے کچھ حیرانی بھی ہوئی اور شبہ بھی۔ اس اندھیری رات میں ایک خوبصورت اور تنہا نوجوان لڑکی کے اس طرح گھومنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ پہلے سوچا ہو سکتا ہے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو۔ یا کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ لیکن پھر خیال آیا، تلاش اور انتظار میں یہ بے پروائی

اور البیلا پن کہاں ہوتا ہے؟ وہکی کا سُرور اب باہر کی کھلی ہوا میں تر و تازہ گلاب کی طرح کھل گیا تھا۔ اور میں اپنی نس نس میں ایک نشاط انگیز و توانائی تھکن بسی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ اور اس کے بعد ایک ہی لمحے ۔ بس ایک ہی لمحے میں نہ جانے میرے دماغ میں میں ایسا کیا ہیجان پیدا ہوا کہ میں لپک کر اُس کے پاس آ گیا۔ اور انگریزی میں اس سے کہا۔

" کیا آپ میرے ساتھ چائے کا ایک پیالہ پینا پسند کریں گی ؟ "

یہ الفاظ کچھ اس تیزی اور سرعت سے بے ساختہ میرے مُنھ سے نکل گئے۔ جیسے میری بجائے کوئی اور میری زبان سے بول گیا ہو اور اس سے پہلے کہ میں اپنی اس جراٴت اور بیباکی کا احساس بھی کرتا اُس نے نہایت اندازِ بے نیازی سے، بڑے شستہ لب و لہجہ میں جواب دیا ـــ

" مجھے کوئی اعتراض نہیں ۔"

" جیسے وہ اس سوال کے جواب کے لیے پہلے ہی سے تیار تھی ۔ "

ہرش نے ایک لمحے کے لئے جائزہ لیا۔ کافی ہاؤس کی گہما گہمی اور ہنگامہ خیز ماحول میں اُس کی ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے زتشی، آنند اور کمار بالکل مبہوت اور مسحور ہو کر گوش بر آواز تھے۔ اور اُس لمحے اُسے اپنے آپ پر صدیوں پہلے کے کسی ایرانی قصّہ گو کا گُمان ہوا جو سرِ عام مجمع لگا کر اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کر رہا ہو۔ وہ دل ہی دل میں اس خیال پر ہنس پڑا۔

" اب ہم ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اُس کے جوان حسین اور گدرائے ہوئے جسم کی بھینی بھینی خوشبو کی آنچ جیسے میرے لہو میں گھُلتی سی جا رہی تھی۔ میرا دل ایک عجیب سی لذت کی شراب اپنی رگ رگ میں اُتار رہا تھا خیالوں میں قوسِ قزح کے رنگ

بکھر گئے تھے۔ اور میرے دوستو! تھوڑی ہی دور چلنے کے بعد میں اُسے ایک چھوٹے سے خوبصورت چائے خانے کی بالائی کیبن میں لے گیا۔ اور وہاں جاتے ہی چائے کا آرڈر دے کر جب میری شراب آلود آنکھیں اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں تو میرے ذہن میں قوسِ قزح کے رنگوں کے چراغ جیسے بجھ سے گئے۔ خون کی گردش تھم سی گئی۔ میں سہم سا گیا۔ اُس کے چہرے پر بہت ہی پُر وقار معصومیت تھی۔ جس نے پہلی ہی نظر میں مجھے بُری طرح مرعوب کر دیا تھا۔ پھر بھی میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اپنے لب و لہجہ میں بے تکلفی پیدا کرتے ہوئے کہا ــــ

" کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟ "

بیرہ چائے کی ٹرے لے آیا تھا۔ اور وہ اپنے نرم نرم ہاتھوں کی لمبی لمبی سپیدی انگلیوں سے چائے بنانے لگی تھی۔ اور میرا سوال گرم گرم چائے کی بھاپ میں تحلیل ہوتا ہوا دہ گیا تھا۔ اور وہ اس مختصر سے کیبن میں کسی معبد کی مقدس مُورتی کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ اُس سے آنکھ ملاتے ہوئے بھی مجھے حجاب سا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر بھی میں نے ایک بار پھر حوصلے سے کام لیا۔

" آپ رہتی کہاں ہیں ــــ میرا مطلب ہے آپ کا شغل کیا ہے ــــ اوہو۔ نہیں معاف کیجئے 'شغل'، میں نے بہت عامیانہ لفظ استعمال کر دیا ــــ میرا مقصد ہے آپ کرتی کیا ہیں؟ "

اور مجھے گھبرایا سا دیکھ کر اس کے چہرے کی معصومیت کی آوٹ میں مسکراہٹ کی ہلکی سی شرمیلی کرن نظر نظر آ کر رہ گئی۔

" آپ مجھ سے میری ذات کے علاوہ کوئی بات کیجئے "۔ فوراً ہی اُس نے کچھ

ایسی متانت سے جواب دیا جیسے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کر رہی ہو۔

اس کے بعد میں نے بہت چاہا کہ کسی طرح پھر سے بات چیت کی ابتدا کر دوں لیکن اُس کی شخصیت، اس کی معصومیت اور اُس کی اِس بات کے تاثر نے مل جل کر مجھ پر جادو سا کر دیا۔ میرے ذہن و دماغ کا شیرازہ جیسے بکھر سا گیا۔ ایک اجنبی عورت سے اِس اچانک ملاقات کے بعد اُس کی ذات کے علاوہ اور کیا بات کی جا سکتی ہے ؛ میں پریشان سا ہو گیا۔ لیکن وہ میری پریشانی سے قطعاً بے پرواہ ہو کر بہت اطمینان سے چائے کی چسکیاں بھرنے لگی۔ اور میں اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ اس پریشانی میں میرے ذہن کی باہنی میں کئی سے کئی چھوٹے چھوٹے اندیشے سر اُبھارنے لگے۔

عجیب پُر اسرار عورت ہے کہیں یہ سب مول تول کے داؤ پیچ اور ہتھکنڈے تو نہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی ماڈرن قسم کی آوارہ عورت ہو۔ اور کاروباری مصلحتوں کی بنا پر سیدھے سادے نوجوانوں کو اُلّو بنانے کے لئے اپنے دھندے پُر معصومیت کی نقاب ڈالے ہوئے ہو۔ لیکن اُس کی معصومیت، بے نیاز اور دلفریب معصومیت چاندنی کی طرح سچی، اجلی، اور بے داغ تھی۔ پھر بھی آدھی رات کے اندھیرے میں اِس سج دھج اور بے تکلفی کے ساتھ اپنی معصومیت کی نمائش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تو پھر ہو سکتا ہے اپنا دماغی توازن کھو چکی ہو۔ لیکن دیوانی ـــــ ایسی خوبصورت، خوش پوش اور تعلیم یافتہ عورت اپنی رفتار و گفتار، اپنے لب و لہجہ کی سنجیدگی اور شائستگی کے باوجود دیوانی کیونکر ہو سکتی ہے ایسا سوچنا بھی دیوانہ پن ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ گھر سے لڑ جھگڑ کر نکل آئی ہو۔ خودکشی کا ارادہ کر رہی ہو۔ یا میری طرح محض احساسِ تنہائی کو دور کرنے کے لئے کچھ دیر کے لئے چہل قدمی ہی کی

غرض سے آگئی ہو۔ ایک دم خیال آیا کہ ایسی بھی تو ہو سکتا ہے کوئی خطرناک قسم کی مخبر ہو کسی مجرم کی تلاش و سُراغ میں بھٹک رہی ہو۔ اور اگر یہ واقعی سی۔ آئی۔ ڈی کی کوئی آفیسر ہوئی تو پھر یقیناً کوئی آفت ڈھائے گی۔ اس بات کا تو اس نے اندازہ کر ہی لیا ہوگا کہ میں نے پی رکھی ہے۔ شراب پی کر راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑنا اور انھیں پریشان کرنا قانون کی نظر میں واقعی جرم ہے۔ اور کیا معلوم یہ ابھی ابھی مجھے گرفتار کروا دے۔ اور گرفتاری کے خیال ہی سے میرا سر تعدد سے گھومنے لگا۔

"بوائے ۔۔۔!"

سُریلی اور مترنم آواز کا ارتعاش کیبن میں لہریے بنانے لگا۔ اور میں نے واقعی خوفزدہ ہو کر نگاہ اُوپر اُٹھائی۔

"اب کیا ہوگا؟"

میرے دل میں پُوری قوت اور خطرے کے ساتھ یہ سوال گونج رہا تھا اور دہکی کاش جیسے تیزی کے ساتھ ہانپتا، کانپتا ذہن کے زینے سے نیچے اُترنے لگا۔ اُس کا تقدس اور اس کی معصومیت یک لخت کسی حسین اور خوش رنگ ناگن کی طرح میرے خوابوں کو ڈسنے لگی۔

بیرہ آیا۔ اس نے بیرے کے ہاتھ سے بِل لیا۔ پھر اپنے سلو لائڈ کے پرس سے پیسے نکال کر بیرے کو دیئے۔ بیرے نے سلام کیا اور چلا گیا۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ میرا سراسیمہ اور خوف زدہ شعور اس سُرعت کا ساتھ بھی نہ دے سکا۔ اور میں بے وقوفوں کی طرح آسیب زدہ سا ہو کر سب کچھ دیکھتا رہا۔

اور اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ نہایت ملائمت اور متانت کے ساتھ

اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر بہت دھیمی سی آواز میں " نمستے " کہا اور میری کسی بات کا انتظار کئے بغیر کیبن سے باہر چلی گئی ۔"

" چلی گئی ۔ ! " زتشی جیسے گہرے خواب سے چونکتے ہوئے ایک دم پھٹ پڑا۔

" ہاں واقعی چلی گئی پہلے تو میں نے سوچا، ابھی لوٹ آئے گی ۔ خون کے با وجود مجھے وہاں اس کا انتظار کرتے رہنا اچھا معلوم ہوا ۔ میں نے آدھا پیکیٹ سگریٹ پھونک دیئے ۔ لیکن وہ نہ آئی ۔"

اور یہ کہنے کے بعد ہریش ایک دم چپ ہوگیا ۔ کھو سا گیا اور زتشی آنند اور کمار بھی اُسے خالی خالی ویران نظروں سے گھورنے لگے ۔

اُس دن کے بعد کیناٹ پلیس میں چلتے پھرتے مجھے جب اُس کا خیال آجاتا ہے تو میں راہ چلتی عورتوں کو دیکھنے لگتا ہوں ۔ لیکن وہ تو کیا، اس کی شکل و شباہت جیسی لڑکی بھی نظر نہیں آتی ۔" ہریش بہت جذباتی ہو کر بولنے لگا " لیکن یار اُس لڑکی کے ملنے کی اتنی خوشی نہیں جتنا اس بات کا غم ہے کہ اس اتفاقیہ ملاقات سے کوئی بات نہیں بنی ۔"

" بات نہیں بنی ۔" زتشی کی پیشانی کی لکیریں سمٹ سی گئیں " ہاں واقعی بات تو نہیں بنی ۔ دراصل تم غیر معمولی طور بزدل اور ڈرپوک ہو ۔ ورنہ بات بننے میں تو کوئی کسر نہ رہ گئی تھی ۔ میرے خیال میں تمہارا پہلا اندیشہ بالکل درست تھا ۔ وہ ضرور کسی شکار کی جستجو میں ہوگی ۔ ایسی لڑکیاں نئی دہلی کے مختلف مقامات پر اکثر گھوما کرتی ہیں ۔"

نہیں ہرگز نہیں ۔ اُس کے چہرے کے معصوم خدوخال اب بھی ایک کتاب کی طرح میرے تصور کے سامنے کھلے ہوئے زتشی ! ہریش نے اس کی بات کاٹتے

ہوئے کہا۔ میں سچ کہتا ہوں اُس کی معصومیت بہت یاد آتی ہے۔ ایسی معصومیت میں نے اس سے پہلے کبھی کسی لڑکی کے چہرے پر نہیں دیکھی بات نہ بننے سے میرا مطلب یہ ہے کہ کاش وہ کچھ اس طرح ملتی کہ بات مکمل ہو جاتی۔ لیکن اس نے تو کوئی بات ہی نہیں کی"

" بات مکمل ہو جاتی — کیا کہہ رہے تم ؟" کمار نے بھی پریشان ہو کر کہا۔

" بھئی میرا مطلب یہ ہے کہ یہ ملاقات یا واقعہ بجائے خود بہت نامکمل پلاٹ ہے۔ بات بن جاتی اگر اس میں ادھورا پن نہ ہوتا۔ اور میں اسے کہانی کی شکل دیکر کسی اخبار یا رسالے کے مالک کے ہاتھ پندرہ رُوپے میں فروخت کر دیتا۔ تم نہیں جانتے مجھے پیسوں کی کس قدر ضرورت ہے۔" ہربنش کی پُر اطمینان اور طمانت آمیز مسکراہٹ جیسے زخمی ہو کر کراہنے لگی۔!!

زیاں دی گریٹ

صبح کے ٹھیک ساڑھے دس بجے کل کی طرح آج بھی زیاں ماحول کے دفتر میں نازل ہوگیا۔ چہرے کی ڈاڑھی کل سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی اور اس کی پاپلین کی سفید دھلی ہوئی قمیص اور پرانی پھٹی ہوئی سیاہ رنگ کی گرم پتلون بیک وقت صبح وشام اور جون اور جنوری کا منظر پیش کر رہی تھی اور وہ آدمی سے زیادہ ایک اچھے بھلے آدمی کا کارٹون معلوم ہوتا تھا۔

اُسے آتے دیکھ کر فریاد بدستور خاموشی سے کرسی پر بیٹھے بیٹھے بائیس نمبر کی بیڑی کے کش لگاتا رہا۔ البتہ نظر کے موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں کے کناروں پر اس کی مخصوص بیمار سی مسکراہٹ کی ایک تھکی ہاری کرن تھرتھرا کر ماند پڑ گئی۔ ماحول کے آئندہ پرچے کے پروف پڑھتے پڑھتے اس نے ایک جماہی لے کر کہا۔

"آؤ شہزادۂ جمہور ــــ آ بیٹھو۔"

بیٹھنے کے لئے کوئی تیسری کرسی نہیں تھی اس لئے شہزادہ جمہوراً آٹھ مربع فٹ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک کونے میں دبک گیا۔

"کل ساری رات مجھے مچھر کاٹتے رہے اور میرا بدن بخار سے پھنکتا رہا" ایک لمحہ کے تامّل کے بعد زیاں نے عینک کے موٹے موٹے گرد آلود بلوریں شیشیوں سے ڈھکی ہوئی اپنی وحشت ناک بھینگی آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے کچھ اس انداز سے کہا جیسے آج کے تازہ اخبار کی نمایاں ترین خبر سنا رہا ہو۔ اور پھر اپنے گھسے پٹے جوتوں سمیت بوسیدہ چٹائی پر لیٹتے ہوئے بولا۔

"تمام رات مجھے ستارے گننے کی ناکام کوشش میں گزارنی پڑی۔"

"ناکام کوشش ـــ ؟" زیاں نے اسی لہجہ میں جواب دیا "شاید آپ نے غور نہیں کیا" رات بھر آسمان پر بادل چھائے رہے۔"

اور زیاں کی اس بات پر فرہاد کے سوکھے ہوئے حلق سے بے ساختہ ایک قہقہہ سا پھوٹ نکلا جیسے اچانک کسی گداگر کا کاسہ کھنک گیا ہو۔

"ستارے گننے کی بجائے ستارے ڈھونڈنے کہو جُنیدا" بیڑی کا آخری کش لگا کر اسے پھینکتے ہوئے فرہاد نے زیاں کے جملے کی اصلاح کی۔

اور زیاں کے بے رونق چہرے پر ایک بجھے بجھے سے مضحمل تبسم کا ملمع چڑھ گیا جس سے اس کی موٹی مرتی آنکھوں کی وحشت اور بھی گہری ہو گئی۔

"مسئلہ دراصل یہ ہے استاد!" وہ اپنی آواز میں گمبھیرتا اور سنجیدگی پیدا کرنے کی ایک اور ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا "اگر تم اس وقت گرم گرم چائے کا ایک پیالہ مجھے پلادو تو میں تمہیں دوپہر کا کھانا کھلا سکتا ہوں۔"

چائے زیاں کی خاص کمزوری تھی۔ وہ دو وقت کے کھانے سے بھی زیادہ چائے کو اہمیت دیتا تھا۔ فریاد جو اس کی اس کمزوری سے واقف تھا طنز اور تعجب سے پوچھنے لگا۔

"وہ کیسے ـــــ مائی ڈیئر زیاں! ـــــ یعنی زیاں دی گریٹ۔ وہ کیسے؟"

اور زیاں نے سوکھے ہوئے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے لیٹے لیٹے ہی اپنی پتلون کی جیب سے ایک نیلے رنگ کی چھوٹی سی کاپی نکال کر فضا میں لہرادی۔

"میری جیب میں کوئی پیسہ نہیں ـــــ لیکن دیکھو یہ کوپن ہیں ـــ" وہ پیشہ ور مداریوں کے سے انداز میں بولنے لگا "لاجپت رائے مارکیٹ کے مہاشہ ریوجی ہوٹل کے چار چار آنے کے سولہ کوپن ـــــ یعنی ایک ایک آنے کی چونسٹھ چپاتیاں ـــ اور دال سبزی مفت یہ کوپن میں نے آج صبح صبح اپنا محبوب اور ایک سوئی کا ٹائم پیس بیچ کر حاصل کئے ہیں" اور فریاد نے ایک دم ہاتھ آگے بڑھا کر کوپنوں کی کاپی کو زیاں کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔

"سچ ـــــ ٹائم پیس بیچ دیا تم نے ـــــ اس کا مطلب ہے تم اپنے کل شام کے فیصلے پر قائم رہے۔"

"ہاں بھئی ـــ" وہ نہایت متانت سے کہنے لگا۔ "آج سب سے پہلا کام ہی یہی کیا ہے۔ اس کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ خدا کی قسم کل رات ویرنگ میں بیٹھے بیٹھے سوچتا رہا۔ آخر اس ظلم کی کوئی حد ہے یار کہ دو وقت کی روٹی کے لئے بھی تین تین میل پیدل سفر کر کے اپنے دوستوں کے گھروں تک پہنچوں۔ اور وہ مجھے روٹی کا ہر لقمہ دیتے وقت کچھ ایسی طنز بھری اور فاتحانہ نظروں سے دیکھیں جیسے

حاتم کے جانشین ہوں سالے ـــــ ہوں ـــ نان سنس ـــ" اور یہ کہتے کہتے اس کے چہرے کی متانت پر جیسے ایک دفعہ پھر تبسم کا ملمع چڑھ گیا اور فریاد کرسی سے اُٹھ کر چلّانے لگا۔

"پیارے زیاں ـــ آفریں ہے تمہاری لیاقت اور عاقبت اندیشی پر چلو ابھی چلو! میں تمہیں اس وقت خلوص دل سے چائے پلاتا ہوں۔"

اور زیاں ایک دم فرطِ مسرت سے بے خود ہو کر اُٹھا نظر بھونچکا سا اپنے روتے ہوئے تبسم کے ساتھ انھیں دیکھتا ہی رہ گیا مگر وہ دونوں بجلی کی تیزی سے باہر نکل گئے۔ راستے میں چند قدم کے فاصلے پر انھیں عابد نے روک لیا۔ عابد جو چند دن پہلے کتابوں کی ایک مشہور دوکان کا منیجر تھا

اور جسے کتابیں چوری کر کے سستے داموں کباڑیوں کے ہاتھ فروخت کرنے کے جرم میں اب ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔

"کہئے زیاں صاحب! آج کل کیا کر رہے ہیں آپ؟"

ایک تو عابد کا یہ سوال بے معنی تھا اور پھر بے وقت بھی کیونکہ زیاں اس وقت چائے کے لیے کھِنچا جا رہا تھا۔

"دن کو مکھیاں مارتا ہوں اور رات کو مچھر۔"

اور زیاں کی یہ بات سن کر عابد نے منہ میں دبائے ہوئے پان کی پیک کو تھوکتے ہوئے زیرِ لب تبسم سے کہنا شروع کیا۔

"زیاں صاحب! کہیں نوکری کر لیجیے ـــــ اس طرح آوارہ گھوم کر آپ کب تک زندگی گزار سکیں گے" عابد کا لہجہ ہمدردانہ سے زیادہ بزرگانہ

تھا۔ مگر زیاں جیسے اس کے ایک ایک لفظ کو پوری توجہ سے سننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور عابد کہے جا رہا تھا۔

"یہ سانی شاعری واعری کا خبط چھوڑیئے ـــــــ اس سے اللہ کی قسم کچھ حاصل نہیں۔ روگ ہے۔ مفت کا روگ اگر کہیں چھوٹی موٹی کلرکی مل جائے تو وہی کر لیجئے اور اُدھر ادھر بازار میں گھومنے کی بجائے اپنا وقت نوکری "تلاش کرنے میں" میں صرف کیا کیجئے۔"

اور ایک دم عابد کو خاموش ہوتے دیکھ کر زیاں تکھی تکھی متعجب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

" بس جناب! یہی کہنا تھا آپ کو ـــــ "

زیاں کے اس سوال پر عابد بھی حیرت زدہ نظروں سے اس کی طرف تکنے لگا

" دیکھئے قبلہ وکعبہ عابد صاحب!" زیاں نے نہایت دھیرج سے کہنا شروع کیا "مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آپ اور آپ جیسے کئی دوسرے مہربان مجھے اپنا ٹیوٹر سمجھتے ہیں اور میرے روبرو ہوتے ہی نہایت سعادت مند شاگرد کی طرح اپنا رٹا ہوا سبق مجھے سنانے لگتے ہیں ـــــ نوکری کرنے کا مشورہ تو ہر کوئی دیتا ہے لیکن نوکری کوئی بھڑوا نہیں دیتا۔ اور پھر سوال یہ ہے کہ حضرت آپ میرے لئے ہی کیوں پریشان ہیں۔ اپنے غم کا انتقام بھی آخر آپ اسی خاکسار کی ذات سے کیوں لیتے ہیں ـ آپ بھی تو میری طرح بے کار ہیں۔ پہلے آپ خود تو کہیں اپنی ملازمت کا بندوبست کیجئے ـــــ "

زیاں کی ایک ایک بات اس کے دل ودماغ کے زہر آب میں ڈوب کر

اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں تک آ رہی تھی اور عابد کے ثلیثی چہرے پر ندامت اور تبسم کی ملی جلی لہریں کھیل رہی تھیں۔

" زندہ باد ۔ زیاں دی گریٹ زندہ باد ــــــ " فریاد نے زیاں کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے نعرہ مستانہ بلند کیا " چلو چلو۔ اب چائے پینے چلیں۔ اچھا عابد صاحب آداب ــــ عرض "

اور عابد کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ دونوں لپک کر ہبّن کے ہوٹل میں داخل ہو گئے اور ہبن کے ہوٹل میں پرانی وضع کے چوبی بنچ پر بیٹھتے ہی فریاد نے بلند آواز سے ہبّن ہوٹل کے واحد بیرے " بنگالی " کو دو چائے کا آرڈر دیدیا۔

اور زیاں اپنے آپ بڑبڑانے لگا " سولہ کوپن ہیں ۔چلو یہی سہی۔ ٹائم پیس کی مجھے کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی ۔ دہلی میں قدم قدم پر گھڑی والے مل جاتے ہیں۔ ہر دکان پر گھڑی موجود ہے ۔ اور ویسے بھی ہم آج کل وقت سے بے نیاز ہیں۔ " " یا وقت آپ سے بے نیاز ہے " فریاد نے ٹوکتے ہوئے کہا

" کچھ سمجھ لیجئے ــــــــ لیکن میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کوپنوں سے کچھ دن تو اچھے گذر جائیں گے ــــ "

" اور پھر؟ " فریاد نے جیسے زیاں کو چڑاتے ہوئے سوال کیا۔

" پھر دیکھیں گے پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے ۔ "

" کچھ نہیں ہو گا مسٹر! ــــــــ یہ جو تمہارے کوپن ظہور میں آئے ہیں پردہ غیب میں چلے جائیں گے اور بس ۔ "

" اور بس " زیاں یہ دو لفظ دہرا کر کھلکھلانے لگا اور " بنگالی " پھٹی پھٹی نظروں

سے دیکھتا ہوا سامنے میز پر چائے کے دو پیالے رکھ کر چلا گیا۔

اتنے میں ایک عمر رسیدہ بزرگ کے ساتھ ایک کمسن سی حسین لڑکی اندر داخل ہوئی اور فریاد نے نظروں ہی نظروں میں ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ طلوع و غروب۔

"سبحان اللہ" زیاں چائے پیتے پیتے یک دم رک گیا اور اپنی عینک کی گرد صاف کرتے ہوئے نہایت بازاری انداز میں داد دینے لگا" مرحبا —— مرحبا —— کیا بات کہی ہے۔"

اور سفید داڑھی سے پٹے ہوئے چہرے کی جھریاں اور بھی نمایاں ہوگئیں۔ جیسے اس جہاں دیدہ بوڑھے کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی کمسن بیٹی کے ساتھ کسی غلط مقام پر آ گیا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے ہوٹل کے اردگرد دیکھا اور پھر نہایت خاموشی سے اس کمسن حسینہ کے ساتھ باہر چلا گیا۔

اور زیاں خالی خالی بھوکی نظروں سے انھیں جاتے دیکھتا رہا اور جب ـــ سے کافی دور نکل گئے تو اس نے اپنی بھدی آواز میں گنگنانا شروع کر دیا۔

"آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا"

اور فریاد نے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے غصے سے کہا "کیا بک رہے ہو —— تم شاعر ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"شاعر ہوں اسی لئے تو شرم نہیں آتی۔" زیاں نہایت ڈھٹائی سے جواب دیتے ہوئے کہنے لگا "یار لڑکی کافی نمکین تھی" اور فریاد زیاں کی وحشت ناک بھینگی آنکھوں کی طرف گھورنے لگا۔ جن میں جنسی بھوک منجمد ہو کر رہ گئی تھی لمحہ

زیاں کہے جارہا تھا: جب وہ میرے قریب سے گزری تو مجھے اس کے جسم سے خوشبو سی آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بالکل ایسی خوشبو جو تنور کی گرم گرم روٹی سے آتی ہے۔"

زیاں کی اس تشبیہہ پر فرہاد قہقہہ مار کر ہنس پڑا "یہ بھوکا کہیں کا ——— سالے بھوک نے تجھے فلسفی بنا دیا ہے اور آنکھوں پر اتنی موٹی عینک چڑھانے کے باوجود تجھے روٹی میں حسن اور حسین میں روٹی نظر آتی ہے۔"

چائے پینے کے بعد وہ دونوں تین کے ہوٹل سے نکل کر جب کھانا کھانے کے لئے چلنے لگے تو زیاں نے ایک دم سنجیدہ ہو کر کہا: "دیکھو ڈیر! ہم یا تو اڈورڈ پاک سے گزر کر اور یا نئی سڑک سے ہو کر لاجپت رائے مارکیٹ چلیں گے۔"

"کیوں اتنا لمبا چکر کیوں لگایا جائے گا۔ دریبے سے ہو کر سیدھے راستے سے کیوں نہیں چلتے۔"

"دوست! زندگی نے ہمارے سیدھے راستے مسدود کر دیئے ہیں۔" "میں سمجھا نہیں تمہارا مطلب" فرہاد نے قدرے حیرت سے کہا۔

میں نے عرض کیا نا کہ سیدھے راستے ہمارے لئے نہیں رہے۔ ہم پیچیدہ اور ٹیڑھی پگ ڈنڈیوں کے مسافر ہیں ——— مسئلہ دراصل یہ ہے کہ دریبے میں عین چوراہے پر جنتا لانڈری ہے۔"

"تو پھر کیا ہے۔"

"مجھے لانڈری والوں کے ساڑھے پانچ آنے ادا کرنے ہیں۔ کپڑے دھلوا کر لے آیا تھا اور وعدہ کر آیا تھا کہ پیسے کل دے دوں گا۔ اس وقت ان بھلے مانسوں نے مجھے بھی بھلا مانس سمجھ کر میرا اعتبار کر لیا تھا لیکن ایک مہینے سے وہ کل نہیں آ رہی۔"

اور فریاد نے اس کے جواب میں چپکے سے اپنے قدم ایڈورڈ پارک کی طرف بڑھادیے اور فریاد کو خاموش دیکھ کر زیاں نے خود ہی گفتگو کا آغاز کیا۔ "لوگوں کا مقروض بن کر مجھے ایک عجیب قسم کی تسکین ہوتی ہے یار!"

"تسکین ——— وہ کیونکر؟"

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف وہی لوگ میری درازیٔ عمر کی دعا مانگتے ہیں جن کا میں مقروض ہوں ۔ ورنہ میرے عزیز و اقارب تو مدت سے مجھے رو چکے ہیں۔"

اور فریاد نے مسکراتے ہوئے نقرہ کسا۔ "یوں معلوم ہوتا ہے زیاں ڈی گریٹ جیسے خدا نے تمہیں پیدا تو ضرور کیا ہے ۔ لیکن پیدا کرنے کے بعد وہ تمہیں قطعی طور پر بھول گیا۔"

"ہم نے کون سا یاد رکھا ہے اُسے۔" زیاں نے نہایت لاپروائی سے جواب دیا اور پارک سے باہر نکلتے ہی ایک ادھیڑ عمر کے سوکھے ہوئے بد شکل اور متعفن بھکاری نے ان کا راستہ روک لیا ۔

"داتا! ایک پیسہ ——— جوڑی بنی رہے ، ایک پیسہ ——— بھگوان کے نام پر ایک پیسہ بابو!"

"معاف کرو بابا ——— معاف کرو" فریاد نے اُسے روکھا سا رسمی جواب دے کر ٹالنے کی کوشش کی ۔

اور بھکاری نے پیچھے چلتے چلتے زیاں کی قمیص ہاتھ میں پکڑتے ہوئے گڑگڑانا شروع کر دیا۔ اور زیاں اپنی میلی میلی آنکھوں سے اسے گھور کر پوچھنے لگا۔

"جنٹلمین! بھارت دیش کی اس راجدھانی میں کب سے بھیک مانگ رہے ہو؟"

بھکاری خزاں کے اس سوال کی نوعیت کو نہ سمجھتے ہوئے بلبلیانہ نظروں سے دیکھتا ہوا پھر وہی جملے دہرانے لگا۔

"اتنی عمر ہو گئی تمہیں بھیک مانگتے ہوئے ــــــــــ مگر پھر بھی اناڑی ہی رہے۔ ارے بابا کچھ تو پہچان لیا کرو ہم کہاں کے داتا ہیں ــــ ذرا غور سے دیکھ کر بتاؤ کیا ہم کسی کو بھیک دینے کے قابل نظر آتے ہیں۔"

بھکاری مایوس ہو کر پیچھے پلٹ گیا اور فریاد نے سود خور پٹھان کے سے لہجہ میں جھلاتے ہوئے کہا۔

"سالے! ایک تو لائے لمبے رستے سے اور پھر قدم قدم پر لکچر فرماتے ہو۔ جلدی چلو۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے"

سیاہ سڑک پر دھوپ پورے طور پر پھیل چکی تھی وہ دونوں سڑک کے ایک کنارے پر گھنے درختوں کی چھاؤں میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے لاجپت رائے مارکیٹ کے کھوکھوں میں پہنچ گئے۔ جہاں ہوٹلوں کی ایک لمبی قطار تھی اور ہر ہوٹل والا چیخ چیخ کر راہ چلتے مسافروں کو کھانے کی دعوت دے رہا تھا۔

زیاں فریاد کو ایک مختصر سے کھوکھے میں لے گیا۔ دونوں اندر بنچ پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر تک کھانا کھانے کے بعد زیاں نے کوپنوں کی نیلی کاپی جیب سے نکالی اور ایک عجیب سی شانِ سخاوت کے ساتھ تین کوپن پھاڑ کر ریفیوجی ہوٹل کے بھاری بھرکم مہاشہ کے ہاتھ میں تھما دیے۔

"اب کہاں جانا ہے ــــ" فریاد نے ہوٹل سے نکلتے ہی سوال کیا۔

"جہاں چلو" زیاں نے چلتے چلتے فریاد کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بے

نیازی سے جواب دیا۔

اور فریاد نے چند لمحوں کے تامل کے بعد کہا۔

" چلو خیالی دنیا کے دفتر میں چلتے ہیں ۔ وہاں سے شاید مجھے کچھ پیسے بھی مل جائیں ۔"

" خیالی دنیا کے دفتر سے پیسے ؟" زیاں نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے خیالی دنیا اور پیسے دو متضاد چیزیں ہوں ۔

" ہاں ہاں بھئی پیسے ـــــ میں نے ان کے تازہ پرچے کے لئے ایک کہانی لکھی تھی اگر رسالہ کے مالک کو وہ کہانی پسند آگئی تو آج پندرہ روپے مل جائیں گے اور پھر میں تمہیں ریگل میں میٹنی شو بھی دکھا سکتا ہوں ۔"

میٹنی شو کے تصور سے زیاں کے چہرے پر تازگی کی ایک ہلکی سی لہر ناچ اٹھی اور وہ فریاد کے دوش بدوش چلنے لگا

" لیکن یار ایک مسئلہ ہے ـــ " چند ہی قدم پر اُس نے کچھ پریشان سا ہو کر کہا۔

" کیا مسئلہ ہے ڈیر زیاں !"

" میں خیالی دنیا کے دفتر کے اندر نہیں جا سکتا ۔"

" کیوں یہ کیا مسئلہ ہے ۔"

" پچھلے منگل کے دن میں ملازمت کے سلسلہ میں وہاں گیا تھا "

" تو پھر ؟ "

اور فریاد کے اس سوال پر زیاں نے رُک رُک کے لہجہ میں پوری روداد سنائی

شروع کر دی اس نے بتایا کہ خیالی دنیا کا مالک سو روپے ماہوار میں چپڑاسی اور ہیڈ سے لے کر مینیجر و مدیر تک کے سب کام لینا چاہتا تھا اور وہ اس کے لیے بھی آمادہ ہو گیا تھا اور تین دن کی ملازمت کے بعد اس نے بیس روپے پیشگی کے طور پر لے لیے تھے مگر چوتھے دن خیالی دنیا کے دفتر میں جانے کی بجائے نوکری کے لیے اپنا نام رجسٹر کرانے کی غرض سے وہ دریا گنج کے ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے دفتر میں چلا گیا تھا۔

"گویا اس کے بعد تم خیالی دنیا کے دفتر میں گئے ہی نہیں۔"

"جی ہاں ـــــــ" زیاں کہنے لگا: "میں نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی"

اور پھر چلتے چلتے زیاں خیالی دنیا کے مالک کے خلاف دل کے پھپھولے پھوڑنے لگا۔ اور دیر تک چبھتے ہوئے طنزیہ جملوں سے اس کا مذاق اڑا اڑا کر تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

اور پھر جب وہ خیالی دنیا کے دفتر کے قریب پہنچ گئے تو فریاد زیاں کو کچھ فاصلے پر چھوڑ کر اکیلا ہی دفتر کے اندر چلا گیا۔

کچھ منٹوں کے بعد جب وہ واپس آیا تو زیاں لپک لپک کر چیمپئن کے سگریٹ کے آخری کش لگا رہا تھا۔

"سناؤ۔ پیارے فریاد! پیسے مل گئے" وہ فریاد کے ساتھ چلتے چلتے امید اور مسرت میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں پوچھنے لگا۔

"پیسے نہیں۔ یہ کہانی ہی بخیر و عافیت واپس مل گئی ـــــ" فریاد کی آواز جیسے اس کے حلق کو چیر کر باہر نکل رہی تھی۔ اور یہ کہنے کے بعد اس نے جیب سے کہانی کا مسودہ نکال کر زیاں کو دکھاتے ہوئے کہا: "دیکھو کہیں کہیں سرخ نشان

لگادیئے گئے ہیں ورنہ اور کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔"

اور زیبا اس کی آنکھیں کہانی کے مسودے کے سرخ نشان دیکھنے کی بجائے خلائیں جھانکنے لگیں جہاں اس کے میٹنی شو کا رنگین اور لہریا تصور دم توڑ رہا تھا۔

"۔۔ اور جہاں جہاں سرخ نشان ہیں ـــ" فریاد چلتے چلتے بہت جذباتی ہو کر بولنے لگا۔" اس سالے رسالے کے ان پڑھ پرو پرائیٹر صاحب کے خیال میں وہ حصے بہت پھیکے ہیں ـــ آپ فرمانے لگے ان حصوں کو رنگین اور شوخ بنا دو۔ صاف یہ نہیں کہا کہ مجھے ایک گندی اور فحش کہانی کی ضرورت ہے۔ پندرہ روپے میں ایک ایسی کہانی خریدنا چاہتا ہوں ـــ جس سے ہزاروں لوگوں کے دل و دماغ پہ جنسی لذت کا تیزاب چھڑک کر ان کی جیبوں پر ڈاکہ ڈال سکوں ـــ ڈاکو کہیں کا پندرہ روپے دے کر مجھ سے شوخی اور رنگینی مانگتا ہے ـــ ہونہہ۔۔ شوخی اور رنگینی ـــ میں پوچھتا ہوں شوخی اور رنگینی میں لاؤں کہاں سے۔ شوخی اور رنگینی نے زندگی سے اپنا ناطہ توڑ لیا ہے"

فریاد جھوٹ بول رہا تھا راستے میں رنگینی بھی تھی اور شوخی بھی! اور خیالی دنیا کی کہانیوں کے کئی کردار اپنے تراشیدہ گیسوؤں گلابی چہروں اور نیم عریاں بازوؤں اور سینوں کے ساتھ چل رہے تھے اور قدم قدم پر حسن و مسرت کا احساس جگا رہے تھے۔ زیبا میٹنی شو کے تصور کا قتل کرنے کے بعد اب ہر راہ چلتی عورت کو نہایت نخوت سے گھورتا ہوا چل رہا تھا۔

کافی دور تک اسی طرح چپ چاپ چلنے کے بعد فریاد نے چلتے چلتے ایک پنواڑی کی دوکان سے ایک بیڑی سلگائی اور پہلا کش لگا کر کچھ اس طرح دھواں چھوڑا جیسے اپنے دل کے غصے اور نفرت کا غبار باہر پھینک رہا ہو اور پھر اپنی کہانی کا مسودہ تہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اور زیبا کی خالی خالی آنکھوں میں جیسے ہلکی ہلکی مسکراہٹ رقص

کرنے لگی۔

"ہم پھر اُردو بازار میں آگئے ہیں ۔" فریاد کی موڈ کو خوش گوار بنانے کے لیے وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا "اردو بازار ہمارا محور ہے ۔ خدا کی قسم آغوش مادر کی طرح کھلا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ یہ سڑک بالکل ہماری ذاتی ملکیت معلوم ہوتی ہے ۔ اس بازار کے ہر موڑ، ہر خم اور ہر ا ردیے میں ہمارے لیے کتنی یگانگت اور انسیت ہے۔"

"تو آؤ آپ پھر ماحول کے دفتر میں چلتے ہیں" فریاد نے ماحول کے دفتر کے قریب آکر اسے ٹوکتے ہوئے کہا" یہ دفتر اُردو بازار کی انگوٹھی کا نگینہ ہے ۔"

اور وہ دونوں ماحول کے دفتر میں پہنچ گئے۔ نظر بدستور اپنے سامنے ماحول کے آئندہ پرچے کے، دف رکھے ہوئے تھا۔ میں وہ صبح سے نہیں پڑھ سکا تھا اور کمرے کی دہلیز پر ایک سفید ریش اکہرے بدن کے بزرگ بالکل اس ڈھنگ سے بول رہے ہیں ۔ جیسے منبر پر کھڑے ہو کر پوری قوم کی غیرت اور حمیت کو بیدار کر رہے ہوں ۔

" نظر صاحب ! دیکھئے تو آج بیس تاریخ ہوگئی ہے ۔ اور ابھی آپ نے پچھلے مہینے پورا مرایہ بھی ادا نہیں کیا ۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر آپ کا مقصد کیا ہے ؟ "

فریاد اور زیاں کو دیکھ کر نظر کے چہرے کی ویرانی میں اور بھی اضافہ ہو گیا تاہم وہ مقصد کے لفظ پر چونکتا ہوا بولا " مولینا مقصد تو نیک ہے ۔ پرچہ چھپ رہا ہے چھپتے ہی وی ۔ پی ۔ بھیجوں گا اور سب سے پہلے آپ ہی کا حساب بے باق کرنے کی کوشش کروں گا ۔"

" لیکن میں پوچھتا ہوں ۔ " مولینا زیاں اور فریاد کی آمد سے مطلقاً متاثر نہیں ہوئے تھے "میں یہ جواب آخر کے دن تک سنتا رہوں گا ۔ آپ کے وی ۔ پی آئیں یا نہ

آئیں۔ بھاڑ میں جائیں۔ مجھے اس سے کیا تعلق۔ مجھے کرایہ وقت پر ملنا چاہیے۔ "

" جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں کچھ دن اور ٹھہر جائیے۔ " نظر نہایت دھیمے سے مولینا کو بھی صبر و سکون کی تلقین کر رہا تھا۔

" دیکھئے مجھے آپ کے یہ طور بالکل پسند نہیں ہیں۔ اگر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے کرایہ نہیں دے سکتے تو از راہِ کرم کوئی اور انتظام کر لیجئے ــــ " مولینا اپنا آخری فیصلہ دے کر وہاں سے چلے گئے اور نظر کی چوڑی پیشانی پر دکھ اور غصے میں اینٹھی ہوئی لکیریں پھیلنے اور سکڑنے لگیں۔

" نظر صاحب! آپ دن بھر کام کرتے ہیں پھر بھی آپ کا یہ عالم ہے " نیاز نے تعجب اور ہمدردی سے ملے جلے لہجہ میں پوچھا۔

" یار نظر تم یہ سالہ رسالہ سالہ ایک دم بند کر دو " فریاد نے نظر کے جواب کا انتظار کئے بغیر فی الفور مشورہ دیا " ورنہ خیالی دنیا کے پروپرائیٹر کے بقول اس میں رنگین اور شوخ کہانیاں چھاپا کرو۔ یعنی اسے فحش بنا دو ــــ "

نظر پریشان ہو کر اپنی گنجی کھوپڑی کو کھجلانے لگا۔ اور کبھی کبھی نظروں سے فریاد کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ " تم لوگ کھانا کھا آئے ــــ "

" ہاں ــــ خوب پیٹ بھر کر کھایا ــــ مگر تم ــــ "

" میں کھانا نہیں کھاؤں گا ــــ میری طبیعت ٹھیک نہیں " نظر نے یہ جملے کچھ اس طرح کہے جیسے کہہ رہا ہو۔ " کمینو! میں صبح سے بھوکا ہوں ــــ میری جیب میں کوئی کوڑی نہیں ــــ اور تم ــــ "

" آؤ ذرا دلشاد ہوٹل میں اکمل کے پاس چلیں۔ "

" وہاں کیا کریں گے ـــــ " فریاد نے نظر کے پروگرام کو وضاحت سے سمجھنے کے لئے سوال کیا۔

" یہاں بھی کیا کریں گے ـــــ "

اور زیاں نظر کے اس سوال پر جھنجھلاتے ہوئے بولا " بجا فرمایا ہے یہاں پھر کوئی اللہ کا نیک بندہ پیسے مانگنے آسکتا ہے وہاں چائے پیئیں گے۔"

اور چائے کے گرم گرم تصور کو لے کر یہ مختصر سا قافلہ ماحول کے دفتر سے روانہ ہو گیا چند ہی قدم پر دل شاد ہوٹل تھا۔

دل شاد ہوٹل کا واحد آقائے نامدار اکمل کوئی تازہ غزل موزوں کر رہا تھا۔ ایک دم ان تین شاعروں کو دیکھا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔

" آیئے۔ آیئے حضرات! ـــــ " اور حضرات کو خالی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ ایک آٹومیٹک مشین کی طرح بار بار چلانے لگا " گلشن اے اے گلشن ـــــ چائے ـــــ گلشن ـــــ چائے ـــــ ارے گلشن "

" چائے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنی تازہ غزل سنایئے " فریاد نے اکمل کو پریشان ہوتے دیکھ کر مشورہ دیا۔ اور زیاں کا سارا بدن جیسے اس بات پر تلملا اٹھا۔ اس نے اپنی وحشت ناک کھنچی آنکھوں کو کچھ اس طرح فریاد کی طرف گھمایا جیسے کہنا چاہتا ہو۔

عنبر کرو مسٹر کیا کہہ رہے ہو۔ تمہارے جملے کی ترتیب یوں ہونی چاہئے۔

اکمل صاحب چائے پلائیے ــــ فوراً " اور جلیے ہی ہو گرم گرم چائے پلائیے ـــ تازہ غزل کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے :

اتنے میں پھٹے پرانے چیتھڑوں میں سجا سجایا گلشن آگیا۔ اور کچھ دیر تک اکمل منہ بگاڑ بگاڑ کر اسے پھٹکارتا رہا۔ پھر جلدی سے چار پیالے چائے لانے کا حکم دیکر اپنی بیاوری کی طرف متوجہ ہوگیا۔

" ہاں بھئی ــ ! چائے ابھی آتی ہے ـــ " وہ اپنی تازہ ادھوری غزل پر اچٹتی سے نظر ڈال کر کہنے لگا " اتنی دیر تک کوئی شعر ہی ہو جائے۔ کہیئے فریاد صاحب آپ آج کل کیا کہہ رہے ہیں ۔ "

" میں شاعری ترک کر چکا ہوں اکمل صاحب ـــــ " فریاد نے فی الفور بلا تامل جواب دیا " آج کل فحش کہانیاں لکھنے کی مشق کر رہا ہوں۔ کیونکہ ان کے پیسے ملتے ہیں ۔ "

" اور پیسوں سے زندگی کی سانسیں ملتی ہیں " زیاں نے بلا وجہ بات کو طول دیتے ہوئے کہا۔ لیکن اکمل کو جیسے فریاد کا یہ جواب کچھ پسند نہ آیا۔ اس کے چہرے پر برہمی کے کچھ نقوش اجاگر ہو گئے ' جیسے کہہ رہے ہوں : شاعری تو چھوڑ دی ہے مگر مفت چائے پینے کی عادت کب چھوڑو گے ۔ "

" آپ نظر صاحب ! ـ آپ نے کچھ کہا ہے ادھر " اکمل نے اپنے گواز ہو متوازن کرتے ہوئے نظر سے رجوع کیا۔

" نہیں بھئی رسالت کا کام ہی اتنا ہوتا ہے کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی "

" اس خدمت کے لئے خاکسار کو ملازم رکھ لیجئے نظر صاحب " زیاں نے نظر

کی گنجی کھوپڑی کی طرف دیکھتے ہوئے جملہ کسا۔ اور زیاں کے اس جملے پر تینوں کھلکھلا کر
ہنس پڑے اور اکمل پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے زیاں سے مخاطب ہوا۔

"اچھا زیاں صاحب! آپ کچھ فرمایئے۔"

اور زیاں نے نہ جانے کس مصلحت کے پیش نظر کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنی ایک
نداتی ہوئی غزل کے شعر سنانے شروع کر دئے۔ جب وہ غزل پڑھ چکا تو فریاد
نے چہکتے ہوئے کہا۔

"زیاں تم باتیں تو شاعرانہ کرتے ہو لیکن تمہارے شعروں میں کوئی بات نہیں ہوتی۔"

اور زیاں خفا ہونے کی بجائے زیر لب مسکرایا "جی ہاں۔ میں وہ مصور ہوں جس
سے رنگ و روغن چھین لئے گئے ہیں۔"

"واہ شہزادہ جمہور، جیتے رہو۔ کیا تپے کی بات کہی ہے۔" نظر نے زیاں کے جملے
کی کچھ اس انداز سے داد دی جیسے ان سب میں وہی اس کی معنوی گہرائی تک پہنچ سکا ہے
اور اتنے میں چائے بھی آگئی اور زیاں کے چہرے پر رونق بھی۔ جب گلشن نے چینی
کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں میز پر رکھ دیں۔ تو سب سے پہلے زیاں نے نہایت احتیاط اور
تعظیم سے اپنی پیالی کو لبوں سے لگاتے ہوئے اکمل کی طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھتے
ہوئے کہا۔

"ہاں اکمل صاحب! اب فرمایئے۔ آپ کیا لکھ رہے تھے۔"

"بس یونہی سے چند شعر۔ ابھی ابھی ہوئے ہیں۔ اپنی نئی بیوی کو خط لکھ رہا تھا
خط لکھتے لکھتے اس غزل کا ماحول بن گیا۔" اور اس مختصر سی تمہید کے اکمل نے چائے
پیتے پیتے ہی شعر سنانے شروع کر دیئے۔

اور شعر سننے کے بعد زیباں ایک دم متفکر ہو کر بولا۔ "اکمل صاحب آپ کی کتنی بیویاں ہیں؟"

"پانچ ــــ"

"پانچ" زیباں نے اپنی وحشت ناک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادرگرد دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں پانچ ــــ اور یہ جو خط میں لکھ رہا ہوں اپنی پانچویں بیوی ہی کو لکھ رہا ہوں۔ یہ غزل بھی خط ہی کا ایک حصہ ہے ــــ حال ہی میں شادی ہوئی ہے" اور اس کے بعد اکمل نے اپنے گھنگھریالے خشک بالوں کو لہراتے ہوئے اپنی پانچویں بیوی کے معاشقہ کی داستان شروع کر دی۔

داستان کافی غیر دلچسپ اور طویل تھی مگر سننے والوں نے احسان فراموشی کا ثبوت نہ دیتے ہوئے نہایت تحمل سے کام لیا۔ اور جب خدا خدا کر کے داستان ختم ہوئی تو وہ تینوں جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور زیباں جاتے جاتے کہنے لگا۔

"اکمل صاحب! سب مقدر کے کھیل ہیں خدا کی قسم آپ کو دیکھ کر خدا کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ آپ کی پانچ بیویاں ہیں۔ شاید اللہ ان میں اور بھی اضافہ کرے لیکن ہم انشاءاللہ عمر بھر کنوارے ہی رہیں گے ــــ"

اور اکمل نے زور کا قہقہہ لگا دیا۔

"کیوں نہ سامنے ایڈورڈ پارک میں چل کر بیٹھیں۔" فریاد نے باہر آتے ہی نظر اور زیباں کو مشورہ دیا۔

"کوئی اعتراض نہیں ــــ کیوں نظر صاحب آپ کا کیا خیال ہے ــــ"

"ہاں تو ــــ چلئے ــــ" نظر نے رک رک کے لہجہ میں تائید کی "مگر میں جلدی ہی دفتر چلا جاؤں گا۔ مجھے پروف پڑھنے ہیں۔"

اور نظر کی آخری بات ان سنی کرتے ہوئے فرہاد اور زیاں اسے ساتھ لیکر ایڈورڈ پارک میں پہنچ گئے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ شام کی خاموش فضا کو ہلکا ہلکا دھندلکا اداس بنا رہا تھا۔ پارک میں ہری ہری گھاس پر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں کئی لوگ منقسم ہوکر بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ نیم دراز تھے۔ چند بنچوں پر اور کچھ گھاس پر بیٹھے ہوئے سستا رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر ایک عجیب سی تھکن کا احساس ہوتا تھا۔ ان کی باتوں پر بھی اسی تھکن کی چھاپ تھی باتیں ــــ لامتناہی۔ بے نتیجہ ــــ اور کھوکھلی باتیں پارک کی ٹھنڈی ٹھنڈی فضا میں دائرے سے بنا رہی تھیں۔

پارک کے مشرقی گوشے میں ایک پستہ قد لحیم شحیم مجمع ساز اپنی رانوں پر زور زور سے ہاتھ مار کر سستی اور نامردی کی تیر بہدف دوائیاں فروخت کر رہا تھا۔ مختلف لوگوں کے درمیان سے گزرتے گزرتے جب وہ اس مجمع ساز کے قریب پہنچے تو وہ اپنا لکچر ختم کرنے کے بعد مجمع کے مختلف لوگوں سے اپنی دواعیات کی شیشیوں کے دام اکٹھے کر رہا تھا۔ اپنے بھاری بھرکم جسم کو مضحکہ خیز صورتوں میں لچکاتا ہوا مختلف خشک سوکھی اور استخوانی ہتھیلیوں سے آٹھ آٹھ آنے جھپٹتا ہوا وہ چیخ رہا تھا اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تیس کے قریب شیشیاں فروخت کر دیں۔

اور فرہاد نظر کو مشورہ دینے لگا۔ "یار نظر! لعنت بھیجو اس سالے ادب پر اور اپنے ادبی رسالے چھوڑو یہی مجمع سازی کا ربار شروع کر لو ــــ ہم تمہارے شریک کار ہوں گے خدا کی قسم مزا آ جائے گا۔" ایک دبلا پتلا مکروہ صورت بھیا آٹھ آنے کی شیشی خرید کر اسے اپنی میلی کچیلی دھوتی میں اڑستا ہوا مجمع سے نکلا تو زیاں نے اسے پکڑ لیا۔

"بھیا جی ذرا ٹھہرو ــــ" زیاں اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگا "فرہاد

صاحب آیئے ادھر بھیاجی کے پاس ـــــ یہ آپ کو ایک فحش کہانی کا پلاٹ دے گا۔"

" ہاں تو بھیاجی کیا کام کرتے ہو ـــ ؟ "

بھیا زیاں کے طرزِ تخاطب پر کچھ اس طرح گھبرا گیا جیسے ابھی چوری کرتے پکڑ لیا گیا ہو

" سبزی منڈی میں جو برلا مل ہے وہاں مجوری کرتا ہوں سرکار! "

" کتنی تنخواہ ملتی ہے۔"

" ساٹھ روپے۔"

" کتنے بچے ہیں۔"

" چار "

" اور ایک بیوی بھی ہوگی "

زیاں کے اس بیہودہ سوال پر فرہاد کو ہنسی آ گئی مگر بھیا نے بدستور اپنی مری ہوئی آواز میں اس سوال کا جواب بھی دیا۔

" جی حجور! ـــ ایک جورو ـــ چار بچے ـــ اور ایک بوڑھی ماں بھی ہے "

" گویا تم کل سات ہو ـــ گھر میں کوئی اور آدمی بھی کماتا ہے۔"

بھیا کی آواز اور زیادہ بے روح ہو گئی " نہیں صاحب اور کون کمائے گا ـــ بڑا بچہ تو ابھی گیارہ سال کا ہے ـ "

" ٹھیک ہے ـــ " زیاں نے جیسے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے اطمینان سے کہا " تو بھیا جی تمہاری سستی اور نامردی کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ تم نے بلا وجہ آٹھ آنے ضائع کئے "

بھیا اور پریشان ہو کر زیاں کی طرف دیکھنے لگا " بابو جی! میں نے یہ دوا کمجوری کو دور کرنے کے لئے خریدا ہے " بھیا نے زیاں کی غلط فہمی کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

"تمہاری صحت اور جوانی اب تمہیں نہیں مل سکے گی بھیا جی! کیونکہ ساٹھ روپے دیکر مل والا تمہاری رگوں کا خون نچوڑتا ہے ۔۔۔ کیونکہ یہ خون اس کی اپنی صحت اور جوانی کیلئے دشمن کا کام دیتا ہے ۔" اچھا بھلا زریاں پھر فلسفی بن گیا تھا اور بھیا اسے متحیر اور مشکوک نظروں سے دیکھتا ہوا اپنی راہ پر ہو لیا: اور وہ تینوں ہری ہری گھاس پر بیٹھ گئے "نظر یار! تم بہت خاموش ہو ۔۔۔ " اور فریاد کی اس بات پر نظر کے سیاہ چہرے پر ایک زخمی سی مسکراہٹ لہرائی جیسے وہ مسکراہٹ کراہتے ہوئے کہہ رہی ہو۔

تم اچھی طرح جانتے ہو۔ میری خاموشی میرے حالات کا تقاضا ہے۔ دوستوں کے ساتھ چہکنے کے لئے مرغن خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور میرا پیٹ صبح سے خالی ہے پیٹ خالی ہو تو زبان بھی کام نہیں کرتی ۔۔۔"

فریاد نے نظر سے مایوس ہو کر زریاں سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"مائی ڈیئر زریاں! ۔۔۔ آج سارا دن تم بیکار گھومتے رہے اور نوکری کی تلاش میں کہیں بھی نہیں گئے ۔۔۔ صبح تم جلال میں آگئے ورنہ اس سالے عابد نے بات تو ٹھیک کہی تھی۔"

"نوکری ۔۔۔ ہائے نوکری ۔۔۔ آہ نوکری ۔" زریاں نے ایک لمبی سرد آہ بھرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "جب یہ لفظ سنتا ہوں تو میرے دماغ میں ایک چھم چھماتی ہوئی دوشیزہ کا خیال آجاتا ہے۔ کتنے دلکش اور سحر انگیز ہیں اس دوشیزہ کے خد و خال۔ لیکن پیارے ۔۔۔ میرے پیارے فریاد۔ یہ دوشیزہ صرف میرے دماغ کے جنگل میں بھٹک سکتی ہے میری ویران روح ہی میں بہار کا خواب بنکر لہلہا سکتی ہے۔ اس جیتی جاگتی دنیا میں نہیں ملے گی۔ اب کہیں نہیں ملے گی۔"

زندہ باد ۔۔۔ زریاں دی گریٹ! زندہ باد!" فریاد نے چیختے ہوئے زریاں کی تعریف

شروع کردی "۔ سالے! تجھے اس دوشیزہ کی فرقت نے واقعی شاعر بنا دیا ہے۔ اگر سچ مچ تجھے نوکری مل گئی تو تو ایسی حسین باتیں کیسے کرے گا ـــ" اور زیاں کے سنگین چہرے پر کوئی نرم و نازک احساس تھرتھرانے لگا "نہیں یہ بات نہیں ـ" وہ ایک دم بے حد سنجیدہ اور متین ہو کر بولنے لگا "اگر مجھے نوکری مل جائے تو میں اس سے بھی زیادہ اچھی باتیں کر سکتا ہوں مسلسل بے کاری اور آوارگی نے میرے ذہن کو ملیا میٹ کر دیا ہے۔ میرے خیالات جیسے نڈھال ہو گئے ہیں۔ میں کوئی اچھی بات سوچ ہی نہیں سکتا۔ جب میں امرتسر میں انشورنس کمپنی کے دفتر میں ملازم تھا تو ــ تو ــ" اور اس کے بعد زیاں نے تصور ہی تصور میں اپنی زندگی کے فروخت شدہ ٹائم پیس کی ایک سوئی کو دو سال پیچھے گھما دیا اور وہ اسی سنجیدگی اور متانت سے بتلانے لگا کہ ملازمت کے دنوں میں اس کی زندگی میں کتنی ترتیب تھی۔ اس کے خیالوں میں کتنا توازن تھا۔ یار دوست اس کی عزت کرتے تھے وہ دیر تک اپنے ماضی کی راکھ کریدتا رہا نظر اور فریاد نہایت اشتیاق سے اسکی ہر بات سنتے رہے اور پھر بولتے بولتے وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ کھو گیا اسکی آواز بجھ سی گئی اور اسکے سنگین چہرے پر کچھ دیر پہلے جس نرم و نازک احساس نے اپنے پنکھ پھیلا دیئے تھے وہ پھر کہیں دور افق میں اڑ گیا اور اس کے چہرے کی سنگینی پر پھر ان حادثات اور پریشانیوں کے خطوط مرتسم ہو گئے جو بیمہ کمپنی کی نوکری میں چھانٹی کے آنے کے بعد نئی ملازمت کی تلاش میں اسے برداشت کرنے پڑ رہے تھے "زیاں واقعی تم ٹھیک کہتے ہو ـ" زیاں کی باتوں سے متاثر ہو کر جیسے نظر نے بھی اپنا مون برت توڑا "تم واقعی موجودہ حالت میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہو۔ اس دنیا ـــ میرا مطلب ہے اس نظام زندگی کو اگر ایک نظم فرض کر لیا جائے تو تمہارا وجود اس میں ایک مہمل شعر نظر آتا ہے " اور زیاں کی متانت اور سنجیدگی پھر رفو چکر ہو گئی

" پہل ہی نہیں نظر صاحب! ۔ غیر موزوں بھی" اور یہ کہکر وہ طنز بھری نظروں سے اپنے غیر متناسب جسم کو دیکھتے ہوئے خود ہی مسکرانے لگا۔" اب مجھے جانا چاہئے ۔" نظر جذبات سے عاری آواز میں بولا" کافی دیر ہوگئی ہے۔ ابھی پروف بھی نہیں پڑھے جا سکے ۔۔" اور یہ کہنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

" اچھا نظر صاحب ۔ یار زندہ صحبت باقی۔" زیاں نے اسے پر تولتے دیکھ کر کہا۔ اور نظر اپنے چہرے پر زخمی سی مسکراہٹ لئے وہاں سے چل پڑا۔ اس کے جانے کے بعد فرہاد اور زیاں نظر ہی کی باتیں کرنے لگے۔ نظر جوان دونوں کا مشترکہ دوست تھا جو ایک ادبی ماہنامہ کے جنون میں اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی کی مسرتوں کو ذبح کر رہا تھا اور گزشتہ دو مہینوں سے فریاد جیسے دفتر میں مقیم تھا۔ اور جس کا کرایہ ادا نہ کرنے کی وجہ سے نظر کو ہر روز سفید ریش مولبیا کا وعظ سننا پڑتا تھا۔" یار نظر واقعی گریٹ ہے۔ کاش اس آدمی کے پاس پیسے ہوتے" زیاں نے نظر کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔" پیسے ہوتے تو گریٹ نہ ہوتا۔" فریاد نے جیسے اپنے تجربوں کی روشنی میں اس تجزیہ کو نکھار دیا پارک دھیرے دھیرے خالی ہو رہا تھا رات کی تاریکی گہری ہو رہی تھی اور پارک کی سب ہریالی اور شادابی اس گھنے اندھیرے کے سمندر میں ڈوبتی جا رہی تھی۔" میرے خیال میں اب ہم بھی یہاں سے چلیں۔" فریاد نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

" جانا کہاں ہے ۔ کھانا کھانے ہی چلتے ہیں ۔"

" تو جاؤ پھر ۔ "

" کیوں ؟ ۔ تمہیں کیا تکلیف ہے "

" کوئی تکلف نہیں۔ میں کبھی کہیں کھا لوں گا ۔"

" میرے ساتھ وہاں کھانے میں کیا حرج ہے ؟"

"ہمارا معاہدہ تو صرف دوپہر کے کھانے کے لئے تھا۔ شام کی چائے تو تمہیں مفت مل گئی۔ اب میرے لئے خواہ مخواہ اپنے کوپن کیوں ضائع کرتے ہو؟" اور زیاں قہقہہ لگاتے ہوئے بولا: "ڈیر فریاد! تم واقعی بزنس مین ہو۔ لیکن آؤ اکٹھے کھانا کھائیں گے اگر تم چاہو تو کھانے کے بعد مجھے چائے پلا سکتے ہو۔" "تو ٹھیک ہے۔" اور یہ کہکر دونوں صبح والے راستے سے پھر رنبو جی ہوٹل میں پہنچ گئے جو ہوٹل کم اور رنبو جی زیادہ تھا۔ وہ دونوں شدت سے بھوک محسوس کر رہے تھے اس لئے ان کی زبان سوکھی چپاتیوں سے بھی لذت اخذ کرتی رہی۔ اور کھانا کھانے کے بعد زیاں اپنے کوپنوں کی کاپی نکالنے سے پیشتر فریاد سے مخاطب ہو کر کہنے لگا

"فریاد صاحب! میرے خیال میں روٹی — یعنی یہ گندم کی تنور میں پکی ہوئی گرم گرم روٹی انسانی تخیل سے بھی زیادہ حسین اور دنیا کی حسین سے حسین چیز سے بھی زیادہ لذت عطا کرنے والی ہے۔ کیوں تمہارا کیا خیال ہے —؟"

"بلاشبہ تمہارے اس فلسفہ سے بھی روٹی زیادہ حسین و لذیذ ہوتی ہے۔ مگر جو روٹی ہم نے کھائی ہے دنیا میں اس سے بہتر روٹیاں بھی موجود ہیں۔" زیاں فریاد کے اس ناشکرے پن سے کچھ زیادہ خوش نہ ہوا۔ صبح کی طرح باہر آکر اس نے بڑے شاہانہ انداز میں کوپن مہاشہ جی کے ہاتھ میں تھما دیے اور مہاشہ جی جو شاید صبح سے زیاں سے کچھ پوچھنے کیلئے الفاظ حلق میں اٹکائے ہوئے تھے ایک دم پھٹ پڑے۔ "شر یمان جی! آپ کس دفتر میں کام کرتے ہیں"

"میں ملازمت نہیں کرتا — میرا اپنا کاروبار ہے مہاشہ جی!"

اور زیاں کے اس جواب پر مہاشے جی تحقیر آمیز نظروں سے اس کے بے ڈول جسم اور بے ڈول لباس کو گھورنے لگے۔ "آپ میرے کپڑوں پر نہ جائیے مہاشہ جی! — میرے گھر میں سوٹوں کے کئی جوڑے پڑے ہیں۔ لیکن بازار میں ہمیشہ پھٹے پرانے کپڑے پہن کر

نکلتا ہوں۔ یہ میری بچپن کی ہابی ہے۔ میرا مطلب ہے مشغلہ ہے۔ اگر آپ مجھے گھر پر ملیں تو شاید پہچان بھی نہ سکیں۔" مہاشہ جی کے ذہن میں جیسے کھلبلی سی مچ گئی لیکن زیاں کچھ ایسی تیزی اور سلامت سے بول رہا تھا کہ انھیں مزید کچھ دریافت کرنے کا حوصلہ نہ ہو سکا اور وہ دونوں ہوٹل سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ فریاد نے ایک بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے زیاں کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا: "نوجوان تو گریٹ ہے۔ یعنی میرا مطلب ہے عظیم ہے۔"

اور زیاں نے مسکراتے ہوئے کہا: "اپنا مطلب اردو میں کیوں سمجھاتے ہو۔ مجھے بھی ریفیوجی ہوٹل کا مہاشہ سمجھ لیا ہے۔ میں نے میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول میں انگریزی پڑھی ہے جھک نہیں ماری۔" اور پھر دونوں اسی طرح کھلکھلاتے ہوئے سڑک پر چلنے لگے بالکل ایسے لاابالیانہ انداز میں جیسے انکی زندگی سے غم کا دور کا تعلق بھی نہ ہو۔ جیسے ان کے ایک ایک بول سے انکی فارغ البالی چھلک رہی ہو۔ جیسے واقعی وہ فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کیلئے دلی کی کشادہ سڑکوں پر گشت کر رہے ہوں۔ ابھی وہ چند ہی قدم چلے ہونگے کہ انھیں ایشیاٹک بار کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے "خیالی دنیا" کا مالک آنند دکھائی دیا۔ زیاں کا رنگ ایک دم اُڑ گیا۔

آنند مغربی لباس میں ملبوس شراب کے نشے میں دھت ہو کر انھیں کی طرف آ رہا تھا۔ ایک لمحہ کیلئے فریاد کو موقع کی نزاکت کا احساس ہوا اور دوسرے ہی لمحہ آنند انکے سامنے تھا۔

"کہیئے فریاد صاحب! کیسا مزاج ہے۔" وہ لڑکھڑاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"ہم غریبوں کا کیا مزاج سرکار!" فریاد نے کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا۔ تو آپ غریب ہیں۔ خوب!"

"غریب نہ ہوتے تو اس وقت ہم بھی آپ کی طرح نہاشہ جی کے کھوکھے کو بیچ

ایشیاٹک بار کے دروازے سے نکلتے ۔" فریلو نے چلتے ہوئے طنز کی اور آنند یہ بھی خوب کہہ کر شیطانی ہنسی ہنسے لگا ۔

" اور ہاں ۔۔ جناب زیاں صاحب ! ۔۔ " اس نے زیاں کی آنکھوں میں اپنی مدہوش آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا " آپ کا کیا حال ہے ؟ "

زیاں اس غیر متوقع سوال کے لئے تیار نہیں تھا ۔ وہ چپ رہا ۔

" کہئے کہیں کام مل گیا "

زیاں اس بار بھی خاموش رہا ۔

" آج کل آپ کا قیام کہاں ہے ؟ "

اور اس سوال پہ زیاں لاوے کی طرح ابل پڑا " کیوں مجھے نوٹس دینا چاہتے ہیں آپ ۔ آپ کے بیس روپے جو ستھیا کرکے گیا ہوں ۔ " اور مدہوش آنکھوں میں جیسے غصے کا الاؤ جلنے لگا " نوٹس ۔ مجھے نوٹس دینے کی ضرورت نہیں ہے ۔ میں بغیر نوٹس کے کبھی تم سے پائی پائی وصول کرسکتا ہوں ۔ "

" مجھے امید نہیں ۔۔ کیونکہ آپ کی وہ اب اکٹھے بیس روپے عمر بھر میری جیب میں نہیں ہوں گے ۔ " آنند جیسے لاجواب ہوکر بوکھلانے لگا " ہونہہ ۔۔ زیاں صاحب ! معاف کیجئے ۔۔ مجھے آپ میں رتی بھر انسانیت نظر نہیں آتی ۔ " اور زیاں اپنے مخصوص منجھے ہوئے لہجہ میں بے اختیار بول اٹھا " معاف کیجئے ۔ مجھے اس میں آپ کی بینائی کا قصور نظر آتا ہے ۔ "

" بینائی کا قصور ۔۔ گویا میں اندھا ہوں ۔۔ تم مجھے گالی دیتے ہو ۔ بے غیرت میرے بیس روپے ہضم کر کے مجھے گالی دیتے ہو ۔۔ کمینے ۔۔ " آنند کی

زبان بری طرح لڑ کھڑا رہی تھی۔ منہ سے انگریزی شراب کی سڑاند کے بھبکے نکل رہے تھے۔ اور اس کی رگ رگ پھڑک رہی تھی

"بلاشبہ — آپ درست فرماتے ہیں۔ میں کمینہ ہوں۔ بالکل کمینہ — آپ کی شرافت اور انسانیت کی قسم کھا کر میں کھلے بندوں اعلان کرتا ہوں کہ میں کمینہ ہوں۔ لیکن اپنی کمینگی پر مجھے ناز ہے بندہ نواز!" زیاں بالکل لڑنے جھگڑنے کے انداز میں بول رہا تھا۔ اس کے لہجہ میں واضح طور پر چیلنج تھا۔ اپنی کمینگی کے بل بوتے پر وہ خیالی دنیا کے پر پرزے کی قوت۔ اسکے وقار اسکی دولت کو للکار رہا تھا۔ کمینہ کہیں کا۔

اس سے پہلے کہ راہ چلتے لوگ یہ تماشہ دیکھنے کے لئے اکٹھے ہو جائیں فریاد نے آنند کو آگے بڑھ کر ایک رکشا میں بٹھا دیا۔ رکشا میں بیٹھ کر بھی ایک شکست خوردہ انسان کی طرح وہ کڑھتا رہا۔ بڑبڑاتا رہا۔ اور اسے وہیں چھوڑ کر فریاد زیاں کو ساتھ لیکر آگے چلنے کی بجائے پیچھے مڑ گیا۔

اس حادثے کے بیس پچیس منٹ بعد ایک معمولی سے چائے خانہ میں زیاں نے چائے پیتے پیتے ایکدم رنجیدہ ہو کر کہا "یار فریاد! آنند سے جو تکرار ہو گئی ہے اس کا مجھے افسوس ہے۔ میں اس سے بالکل الجھنا نہیں چاہتا تھا اپنی سخت کلامی پر اب بے حد ندامت محسوس ہو رہی ہے۔" "ارے زیاں دی گریٹ تو واقعی گریٹ ہے —" فریاد نے زیاں کی بات کو ہنسی میں ٹالتے ہوئے جواب دیا "آج تیرے افلاس نے خدا کی قسم امارت کے منہ پر تھوک دیا ہے۔" زیاں کی رنجیدگی جیسے اس بات پر مطمئن نہ ہوئی۔ "نہیں فریاد گریہ ہونے کی بات نہیں ہے۔ مجھے سچ مچ اپنی اس حرکت پر دکھ ہو رہا ہے۔" "سالے! تجھے کیا دکھ ہو گا" فریاد نے ایک لمبا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "تو تو خود ایک دکھ ہے مائی ڈیئر!"

— ٭ —